
مضامین شوکت

مضامینِ شوکت

شوکت تھانوی

ادارہ فروغِ اردو لاہور

جملہ حقوق ڈی اکیکن پبلشر محفوظ ہیں

بارِ دوم قیمت ۵۰/۰

محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر
شائع کی۔

فہرس

مشرقی پاکستان کے نام

تاکہ اُردو پر دانت پیسنے والے ہنس سکیں

اے دلربا تیرے لئے

شاعر چلغوزے کھا رہا تھا ——

سامنے کی چھت پر اس کی محبوبہ گنّا چُوس رہی تھی ——

اور دونوں کے درمیان ایک گہری اور تنگ گلی حائل تھی۔ وہ سنگ دل گلی جس کی گہرائیاں صرف روپیہ سے پاٹی جا سکتی تھیں۔ شاعر کے افکارِ عالیہ اس خلیج کو پُر نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ دُنیا ابھی اتنی فن شناس نہیں ہوئی ہے کہ وہ اس چلغوزے کھانے والے اور کان پہ کھُبی ہوئی بیڑی رکھنے والے فن کار کی قدر و منزلت کا اندازہ کر سکے۔

وہ اپنی محبوبہ کی شان میں ہر روز ایک نئی نظم کہتا اور خود ہی اُس کے ترنّم میں

ہچکولے کھا کر رہ جاتا۔ کاش اُس کی محبوبہ کا ناشناس باپ عرائض نویس ہونے کے علاوہ تھوڑا بہت سخن فہم بھی ہوتا۔ اور اس بات پر فخر کر سکتا کہ اتنا بڑا فنکار خود اس کی دختر کو اپنا موضوعِ شعر بنائے ہوئے ہے۔ مگر وہ سخت کور ذوق تھا۔ ناک کی پھنگی پر عینک لٹکائے ہوئے دن بھر کچہری کے احاطہ میں عرائض نویسی کرتے کرتے اس میں لطافت کی حِس ہی باقی نہ رہی تھی۔

مگر شاعر کو نہ آغاز کا کبھی پتہ چلا اور نہ انجام کی فکر نے کبھی ستایا۔ اس کو تو کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس کا مقصدِ حیات صرف یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کو دیکھے اور اپنے افکار کو اس کے تصور سے جگمگاتا چلا جائے۔ آج اُس نے اپنی محبوبہ کو پہلی مرتبہ گنا چوستے دیکھا۔ چلغوزے کھانے کی رفتار پہلے دھیمی پڑی پھر یکا یک تیز ہو گئی اور آخر اُس نے مٹھی بھر چلغوزے ایک طرف رکھ کر کان پر لگی ہوئی بیڑی سُلگائی۔ اُس وقت شعریت اُس کے جذبات میں انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس کو محسوس ہوا کہ عرش سے اس کے لئے سامانِ نوا آ رہا ہے اور فلک کے دروازے اُس پر کھل گئے ہیں۔ اس نے جھوم کر قلم اُٹھا لیا۔ کچھ گنگنایا۔ کچھ سر دُھنا اور یکا یک ایک ڈھلا ہوا مصرعہ صفحۂ قرطاس پر آ گیا۔ ؎

اُف بِنتِ نے شکر تری شکر فروشیاں

وہ گنگناتا رہا۔ جھومتا رہا۔ سر دُھنتا رہا۔ بیڑی پہ بیڑی پیتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسرا مصرعہ نازل ہوا۔ اور مکمل شعر صفحۂ قرطاس پر ذی روح نظر آنے لگا۔ ؎

اُف بنتِ نے شکر تری شکر فروشیاں
شیریں تری نگاہ ہے میٹھی تری زباں

اور اس نے جلدی جلدی دو تین چلغوزے کھائے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی محبوبہ کا گنا ختم ہونے سے پہلے نظم مکمل ہو جائے وہ ٹہل ٹہل کر اپنا شعر گنگنا رہا تھا۔ کبھی کسی سُر میں اور کبھی کسی دُھن میں کہ وہ یکایک آنکھ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ کچھ بڑبڑایا۔ کچھ سر کو جھٹکا دیا۔ پھر گنگناتا ہوا دوڑا کاغذ کی طرف اور دوسرا شعر کاغذ پر بکھیر دیا۔

ہر اک ادا میں رس ہے ہر اک بات میں مٹھاس
کیوں تلخیوں کا پھر ہو گزر تیرے آس پاس

اور اب سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ یہ علامت یا تو الہام کی تھی یا واقعی اس کا جی متلا رہا تھا۔ پنسل سے اُس نے ایک بطخ کی تصویر بنائی جو کچھ خرگوش سے ملتی جُلتی تھی اور یکایک پنسل رکھ کر اُس نے پھر بیڑی کے دم لینا شروع کر دیئے۔ یہاں تک کہ اُس کو پھر قلم اُٹھانا پڑا۔ اور بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر کاغذ پر اس طرح دھواں چھوڑا کہ اسی پردے میں تیسرا شعر بھی کاغذ پر منتقل ہو گیا جو دھواں چھٹنے کے بعد پڑھا جا سکا۔

شہد و شکر سے بڑھ کے ترا ہر خیال ہے
پھر بھی میں تلخ کام ہوں یہ بھی کمال ہے

اس نے تینوں شعر جھوم جھوم کر سلسلہ وار اپنے خاص ترنّم میں پڑھے اور تیسرے شعر کے بعد ہی اس نے قلم اُٹھا کر چوتھا شعر بغیر بیڑی پیئے لکھ دیا ہے

تیرے لئے مٹھاس زمانے کی اور رس
مجھ تلخ کام کے لئے غم تیرا اور بس

نظم اب مکمّل تھی اور اس کی محبوبہ کا گنّا بھی ختم ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ اُٹھی، اپنا دوپٹہ جھاڑا۔ چھپاتے ہوئے ہاتھ اپنے گھنیرے بالوں پر پھیرے اور ایک ٹانگ سے اُچکتی ہوئی کوٹھے سے نیچے اُتر گئی۔ شاعر نے ایک آہ سرد بھری۔ اپنے اشعار پر نظر ڈالی اور آسمان کی طرف حسرت سے تکنے لگا کہ اے چرخ ستم گار دیکھ لیا تو نے کہ ان آبدار موتیوں کا مول کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ لعل و جواہر یوں ہی انمول پڑے کنکر پتھر کی طرح بیکار رہیں گے۔ وہ سوچتا رہا۔ دیر تک سوچتا رہا۔ اس کا سلسلۂ خیال دور۔ بہت دور بلکہ اس سے بھی دور تک جا پہنچا۔ اور جب وہ لڑتی ہوئی چڑیوں کے اپنے سر پر گرنے کی وجہ سے چونکا ہے تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی۔ وہ طے کر چکا تھا کہ میں اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے کے لئے وہ روپیہ بھی جمع کر ونگا جو کبھی میرا موضوع نہیں رہا ہے۔ میں خفیس ہمز ہجوں گا۔ میں قصیدے لکھوں گا۔ میں بڑے بڑے لوگوں کے مرنے کا انتظار کروں گا تاکہ ان کی وفات کے تاریخی قطعے نظم کروں۔ میں ہر صبح پیدائش واموات کے میونسپلٹی والے منشیوں سے ملا کرونگا تاکہ معلوم ہو سکے آج کس بڑے آدمی کے یہاں ولادت ہوئی ہے تاکہ

تہنیتی نظم لکھوں۔ اور اب مَیں مشاعروں میں جانے کی فیس لیا کرونگا:

شاید شاعر کی دُعا قبول ہوگئی۔ اسی وقت کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور شاعر بیڑی کو بجھا کر کان پہ لگاتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ آنے والے ایک مشاعرے کے منتظمین تھے جو اپنے مشاعرے کے لئے شاعروں کی بھرتی کرنے نکلے تھے۔ بھرے بھرے لفافے اُن کے ہاتھ میں اور بکھرا ہوا تبسّم ان کے چہروں پر شاعر اپنے دروازے کے سامنے ہی گلی میں ان کا خیر مقدم کیا۔ ایک صاحب نے کارڈ پیش کرتے ہوئے بڑے انکسار سے فرمایا:۔

"یہ مشاعرہ بڑی تاریخی اہمیّت رکھتا ہے پچھلے سال اِس مشاعرے میں صرف مقامی شاعر آئے تھے مگر اس مرتبہ اطرافِ عالم سے مشاہیر شعرا تشریف لا رہے ہیں۔ چائے کا انتظام بھی پُر تکلّف ہوگا۔ پچھلے سال شعرا کو چائے میں شکر کی کمی کی شکایت رہ گئی تھی لہٰذا اب کی ہم نے خاص کوٹا حاصل کر لیا ہے شکر کا۔ اور سگریٹ بھی اب کی ہماری مجلسِ انتظامیہ نے طے کیا ہے کہ کم سے کم پاسنگ شو ضرور ہو ———"

دوسرے صاحب نے فرمایا "طرحیں ایک درجن ہیں اور اس کا بھی آپ کو اختیار کہ جس طرح کا چاہے قافیہ جس طرح میں رکھ لیں۔ پھر بھی اگر زحمت ہو تو غیر طرح ہی سہی"

تیسرے صاحب کیوں چپ رہتے وہ بھی بولے "کوشش کی گئی ہے کہ

اِس مرتبہ سامعین سے شعراء کی تعداد بڑھنے نہ پائے۔ صرف اُن ہی شاعروں کو پڑھنے کی اجازت دی جائے گی جو یا تو مدعو ہوں یا اپنے اپنے حلقہ کے پولیس اسٹیشن سے اس بات کی تصدیق کرا کے لائیں کہ ان کا کلام مالِ مسروقہ نہیں ہے اور وہ واقعی شاعر ہیں۔ مگر آپ کے لئے یہ قید نہیں ——— آپ تو ماشاءاللہ مانے ہوئے ہیں۔"

شاعر نے بہت غور سے سب کچھ سُنا مگر وہ اب طے کر چکا تھا کہ بغیر فیس کے کسی مشاعرے میں نہ جائے گا۔ اس وقت اس کی نگاہوں میں اسکی محبوبہ کا تصور رقص کر رہا تھا۔ اُس نے بڑی متانت سے کہا۔

"آپ کی اس دعوت کا شکریہ مگر میں اپنا ایک اصول بنا چکا ہوں کہ شاعر کے وقت کی بھی آخر کچھ نہ کچھ قیمت ہوتی ہے" ———

ان لوگوں نے کورس میں کہا "قیمت؟"

شاعر نے کہا "جی ہاں قیمت۔ اور میں طے کر چکا ہوں کہ بغیر کچھ لئے کسی مشاعرے میں نہ جاؤں گا۔"

ایک صاحب نے کہا "مثلاً ———"

شاعر نے اب تک خود اپنا نرخنامہ مرتب نہ کیا تھا۔ نہ ڈنڈکا ڈنٹ کے قواعد مرتب تھے، نہ کمیشن کے اصول مقرر، پھر بھی اُس نے اس طرح کہا گویا سب کچھ طے ہے۔

"دیکھئے اگر آپ آمد و رفت کے لئے سواری کا خود انتظام فرمائیں تو صرف شرکتِ مشاعرہ کا ہدیہ میں دس روپیہ قبول کروں گا بشرطیکہ مجھ سے صرف ایک ہی غزل یا نظم سُنی جائے۔ اور اگر ایک سے زیادہ چیزیں مجھ کو سُنانا پڑیں تو فی نظم یا غزل پانچ روپیہ مزید۔"

ایک صاحب نے کچھ ہاتھ ملتے ہوئے کہا "مگر قبلہ جیسا کہ آپ کو اس کارڈ سے معلوم ہوگا یہ مشاعرہ تو یتیم خانہ کی طرف سے ہو رہا ہے۔"

دوسرے صاحب بولے "صرف کارڈوں کی چھپوائی کا بار اس قدر زیادہ ہے کہ آیندہ سے غالباً ہم لوگ سلیٹ پر دعوت نامہ لکھ کر گشت کرا دیا کریں گے۔"

تیسرے صاحب نے کہا "مشاعرہ میں ٹکٹ ضرور رکھا ہے تاکہ یتیموں کی کچھ امداد ہو جائے مگر بیشمار لوگ بیرنگ بھی آجائیں گے۔"

شاعر نے اپنے اصول پر سختی سے قائم رہ کر کہا "درست ہے مگر اصول بھی کوئی چیز ہے۔"

ایک صاحب نے دوسرے صاحب سے کچھ سرگوشی کرنے کے بعد کہا "اچھا قبلہ تھوڑی سی ترمیم فرما ہی دیجئے اپنے اصول میں۔"

شاعر تو نا اُمید ہی ہو چکا تھا اُس نے جلدی سے کہا "ہاں ہاں فرمائیے۔"

وہی صاحب بولے "ہدیہ دس کے بجائے پانچ رکھیئے۔ البتہ اگر ایک سے زیادہ چیزیں آپ سے سنی گئیں تو فی غزل یا نظم دس روپے رکھ لیجئے"
شاعر نے کہا "مگر اس میں تو آپ کا نقصان ہے"
وہ صاحب بولے "جی نہیں ہم اپنے مشاعرے کا رنگ سمجھتے ہیں اس لئے ہم صرف یہی ترمیم بلکہ آپ کے اصول میں ذرا سا ردو بدل چاہتے ہیں"
دوسرے صاحب بولے "اور قبلہ اتنی رعایت اور دیجئے کہ سواری کا انتظام بھی خود ہی فرما لیجئے"!
شاعر ممکن تھا کہ انکار کر جاتا کہ اس کی محبوبہ کا تصور پھر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگا لہٰذا وہ راضی ہو گیا۔ منتظمین نے پانچ روپیہ کا نوٹ شاعر کے ہاتھ پہ رکھا اور شاعر سے رسید لکھوا کر رخصت ہو گئے۔
اب شاعر خوش تھا۔ اُس نے اپنی شاعری کی پہلی کمائی کی تھی اور اب اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر یہی رفتار رہے، تو اس کی محبوبہ اُس سے بہت دنوں تک بچھڑی نہیں رہ سکتی۔ اس گہری اور تنگ گلی کو مشاعروں کی یہ آمدنی پاٹ کر رکھ دیگی۔ اور وہ اپنی محبوبہ سے ایک ہی سطح پر مل سکے گا۔
مشاعرے کے دن شلو نے دن بھر کپڑے دھوئے۔ اور جوتے کو ٹھیک کرایا۔ شام کو وہ اپنی بیاض لے کر چار میل کی چہل قدمی کرتا ہوا مشاعرہ گاہ تک اس حالت میں پہنچا کہ جوتے کی تمام مرمت کی قلعی کھل چکی تھی۔ مشاعرے کا پنڈال حاضرین سے

کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شاعر کو منتظمین نے شعرا کی صف میں پہنچا دیا۔ اور مشاعرہ شروع ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں شاعر کا نام پکارا گیا اور وہ ایک خاص وقار سے اُٹھ کر مائیکروفون تک آیا۔ تمام پنڈال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ شاعر نے گلا صاف کر کے مائیکروفون میں منہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"حضرات میری نظم کا عنوان ہے "ایک حسینہ کو گنا چوستے دیکھ کر ——"

حاضرین نے قیامت خیز تالیاں بجائیں۔ چند اوباش قسم کے لوگ ہنس بھی پڑے۔ ایک آواز آئی ——

"کیا گنڈیری والے جمع ہو گئے ہیں۔"

جناب صدر نے میز پہ ہاتھ مار کر کہا۔

"خاموش! حضرات خاموش!!"

شاعر نے بڑے ہی لحن سے نظم شروع کی۔

اُف بنتِ نیشکر تری شکر فروشیاں

اور پنڈال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ شاعر نے اِس طوفان کے تھمنے کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔

"حضرات! میں آپ کے سامنے نہ کوئی تماشہ دکھا رہا ہوں نہ کوئی لطیفہ عرض کر رہا ہوں۔ پھر اس ہنسی کے معنی آخر کیا ہیں؟"

ایک آواز آئی "اُف بنتِ نیشکر ——"

پنڈال پھر قہقہوں سے گونج اُٹھا منتظمین میں سے ایک صاحب نے شاعر کے قریب آ کر کہا:۔

"آپ اب کوئی غزل شروع کر دیجئے!"

شاعر نے کڑے تیوروں سے کہا "جناب والا! میں غزل گو شاعر نہیں ہوں۔ اور اب تو میں کچھ بھی پڑھنا نہیں چاہتا۔"

منتظم صاحب بولے" ویسے آپ کی مرضی مگر آپ تو مُنہ مانگا معاوضہ بھی لے چکے ہیں۔"

اور شاعر کی نگاہوں کے سامنے اس کی محبوبہ کا تصور پھر رقص کرنے لگا۔ اُس نے حاضرین کے شور کی پرواہ کئے بغیر اپنی نظم بڑے جوش و خروش سے شروع کر دی۔ تالیوں اور قہقہوں کی قیامت برپا تھی مگر شاعر نظم پڑھ رہا تھا۔ اس لئے کہ اب وہ پانچ کا نوٹ واپس نہ کر سکتا تھا۔ اس میں سے کچھ صرف ہو چکا تھا اور باقی سے اس کو اس گہری اور تنگ گلی کی خلیج کو پاٹنا تھا جو اس کے اور اس کی محبُوبہ کے درمیان حائل تھی۔

جس وقت شاعر نظم پڑھ کر واپس آیا ہے، وہ پسینہ میں شرابور تھا۔ منتظمین اس کو دانت پیس پیس کر گھور رہے تھے۔ اور جناب صدر نے تو کئی مرتبہ نظم خوانی کے دوران میں یہ ارادہ کیا تھا کہ شاعر کو مُنہ پر پٹی باندھ کر پنڈال سے باہر نکلوا دیں۔

مگر اب مشاعرہ کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ نہایت سکون سے ایک صاحب کی غزل سُنی جا رہی تھی اور شاعر پانچ روپیہ کے بار سے ہلکا ہو کر جیب سے نکال نکال کر چلغوزے کھا رہا تھا۔ اس کی محبوبہ اس کے تصوّر میں اس وقت بھی گنّا چوس رہی تھی۔ اور اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ درمیانی گلی کا خلاء تھوڑا بہت پُر ہو چکا ہے۔

شاہین بچے

میرے یہاں خدا کے فضل سے تین شاہین بچے ہیں۔ جو آپ کی دعا سے خاکبازی کی تعلیم حاصل کرنے میں شب و روز مصروف ہیں اور اگر سچ پوچھیئے تو میں خداوندانِ مکتب کا ممنونِ احسان ہوں کہ وہ ان شاہین بچوں کو یہی یقین دلائے ہوئے ہیں کہ وہ ممولے ہیں۔ جس طرح اللہ آمین سے ان کو پروان چڑھا کر مکتب جانے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح مکتب بھی ان کے لئے بسم اللہ کا گنبد بنا ہوا ہے۔ جہاں ان کو خود اڑنا نہیں سکھایا جاتا۔ بلکہ پروں کی گیند اچھالنا سکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ تینوں شاہین بچے جب اسکول سے گھر آتے ہیں۔ تو ایک جال تان کر دن چھپے تک بیڈمنٹن کھیلا کرتے ہیں۔ اور وہ پروں والی گیند ان کے درمیان اچھلا کرتی ہے جب تمام شٹل کاک

حرب ہو جاتے ہیں۔ تو ان شاہین بچوں کی ماں مجھ سے کہتی ہے۔ کہ سے

پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

اور میں اسی دن ایک درجن شٹل کاک بازار جا کر خرید لاتا ہوں۔ اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ شاہین بچے نہایت محفوظ قسم کا کھیل کھیلتے ہیں۔ جس میں نہ کوئی جان جوکھم کا معاملہ ہے۔ نہ منہ ٹوٹنے اور سر پھوٹنے کا کوئی اندیشہ۔ اگر بارش ہو گی۔ اور پروں والی گیند کی پرواز میں کوتاہی واقع ہو گی۔ تو یہ شاہین بچے ایک بڑی سی میز پر جال تان کر چھوٹی چھوٹی تھاپیوں سے سلولائڈ کی ہلکی پھلکی گیند سے ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں۔ جس کو وہ پنگ پانگ کہتے ہیں۔ یہ کھیل بھی کچھ خطرناک نہیں ہے کہ چوٹ چپیٹ کا اندیشہ ہو۔ یا مثلاً کیرم ہے۔ یہ بھی محفوظ قسم کا کھیل ہے۔ کہ انگلی ذرا بچا کر اسٹرائکر چلایا جائے۔ تو کسی قسم کے گزند کا امکان نہیں۔ بڑا شاہین بچہ چونکہ کالج میں پڑھتا ہے۔ لہٰذا وہ کبھی کبھی بلیرڈ کھیلنے بھی چلا جاتا ہے۔ یا اپنے احباب کو بلا کر جو اتفاق سے سب کے سب شاہین بچے ہیں۔ تاش وغیرہ کھیل لیتا ہے۔ اس میں نقصانِ مایہ تو ہے۔ بلکہ شماتت ہمسایہ بھی ہے۔ مگر یہی کیا کم ہے۔ کہ زندگی کے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ کہ جان کا صدقہ مال ہے۔ لہٰذا میں اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں کہ وہ برج اور پوکر وغیرہ کھیل کر کچھ ہار جاتا ہے مگر ہاکی اور کرکٹ قسم کے خطرناک کھیل تو نہیں کھیلتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قمار بازی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہی کیا کم ہے کہ کوئی جان کی بازی نہ لگائے۔ جب تک

ہیں گما رہا ہوں ان کی تمار بازی بھی ایک قسم کی بارگیشس بابا بازی ہے۔ اس کے بعد خود ہی سنبھل جائیں گے مطلب تو یہ ہے کہ کسی طرح بھی تو بچیں۔

میں اپنے اوپر زمانے کی تمام سختیاں ان ہی شاہین بچوں کے لئے جھیلتا ہوں کہ ان کا بال بیکا نہ ہو۔ جاڑے کی ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں لحاف ایسی نعمت کو چھوڑ کر میز پر بیٹھا دماغ کو ان ہی کے آرام کے لئے تو نچوڑا کرتا ہوں کہ ان کے لئے سویٹر سے لے کر سپیر تک ہر چیز اعلیٰ درجہ کی میسّر آ سکے۔ اور جب مئی جون کی آگ برسانے والی گرمی انسان کو بھون کر رکھ دیتی ہے۔ میں ان شاہین بچوں کے لئے خسخانہ اور برفاب کو کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنی تکلیف کا خیال کئے بغیر ان سے یہی کہتا ہوں۔ کہ ؎

تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

اور ان کو پہاڑ پر بھیج کر خود اسی جہنّم میں بدستور محنت کرتا رہتا ہوں کہ ان کے پہاڑ کے اخراجات برابر بھیجتا رہوں اگر وہ کہتے بھی ہیں "آپ نہیں چلیں گے پہاڑ پر" تو کہہ دیتا ہوں کہ میں تم کو محض اس لئے شاہین بچہ کہتا ہوں کہ تم مجھ کو کرگس ہی سمجھتے رہو۔

میرے یہ شاہین بچے تکلیف اٹھانے کے عادی نہیں ہیں۔ فاقہ تو خیر خدا دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ یہ شاہین بچے تو موٹا جھوٹا بھی نہیں کھا سکتے۔ کھانا تو دور کنار اگر چائے کا وقت بھی ٹل جائے۔ تو ان کے دشمنوں کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ جمائیاں

اور انگڑائیاں لینا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بھی چائے نہ ملے تو درد سر اور اگر درد سر کے بعد بھی چائے میسّر نہ آئے تو حرارت۔ حرارت کے بعد بخار اور پھر بخار تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ ہزاروں طرح کا ہوتا ہے۔ لہٰذا طے یہ ہے کہ اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔ مگر ان کو وقت پہ چا ضرور ملنا چاہیئے۔ پھر چائے بھی نگوڑی ناٹھی قسم کی نہیں خالی چائے تو کلیجے پہ لگتی ہے تیر کی طرح کچھ نہ کچھ تو چائے کے ساتھ کھانا ہی چاہیئے۔ اور اس کچھ نہ کچھ کے ذیل میں کیک۔ پیسٹری۔ بسکٹ مختلف قسم کے پھل سب ہی کچھ آتے ہیں۔ رہ گیا کھانا وہ اگر ان شاہین بچّوں کو اچھا نہ ملے گا۔ تو یہ نازونعم میں پلے ہوئے اپنی صحت کیونکر برقرار رکھ سکیں گے۔ صحت تو خیر روٹی اور سالن سے بھی برقرار رہتی ہے۔ مگر دل کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ محسوس کر کے کہ یہ غریبوں کا کھانا ہے۔ اور امیروں کے دسترخوان پہ انواع و اقسام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ان شاہین بچّوں کو ضعف قلب سے بچانے کے لئے کھانے کا بھی معقول ہی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ان کو اپنے باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیمی کا احساس نہ پیدا ہو۔ اور باپ کے گھر کو وہ یتیم خانہ سمجھ کر دل شکستہ نہ ہو جائیں۔

یہ فائدے کی بات ہے کہ اچھا کھانے والے اچھا پہننا بھی چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے لباس میں ہر طرح کا تکلّف برتتے ہیں۔ مگر اولاد کو کچھ اس طرح پہناتے اڑھاتے ہیں کہ وہ کچھ لے پالک یا سوتیلی سی اولاد نظر آتی ہے۔ اس قسم کے بچّے ابتدا ہی سے احساسِ کمتری کا شکار ہو کر گس زادے

تو خیبر بن جاتے ہیں۔ مگر شاہین بچے نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنے شاہین بچوں کو اپنی اوقات سے زیادہ شاندار لباس بھی مہیا کرتا ہوں اور وہ بھی ایسے تمیزدار ہیں۔ کہ کیا مجال کہ نیلے سوٹ پر براؤن جوتا یا کریم رنگ کے پتلون پر سیاہ بوٹ تو پہن لیں۔ میری آنکھوں میں خاک ایسے جامہ زیب بچے آپ کو مشکل ہی نظر آئیں گے۔ میری آنکھوں میں خاک میں نے اس لیئے عرض کیا۔ کہ ماں باپ کی نظر سب سے زیادہ اولاد کو لگتی ہے۔ پھر یہ کہ میرے شاہین بچے اس قدر نفاست پسند ہیں۔ کہ اگر آپ ان میں سے کسی کی ڈریسنگ ٹیبل دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ کنگھا تو میز پر کیا معنی وہ جیب میں بھی رکھتے ہیں۔ آئینے اور کنگھے کے علاوہ بے شمار شیشیاں ڈبے اور ڈبیاں آپ کو ان کی ڈریسنگ ٹیبل پر سجی ہوئی نظر آئیں گی۔ رات کو لگانے کی کریم الگ ہے۔ صبح کو لگانے کی اس سوا الگ ناخن تیز کرنے کے اوزار۔ بالوں میں چھلے بنانے کے کل پرزے۔ بھنوؤں کا تناسب قائم رکھنے کے لیئے بال کی کھال نکالنے والی قینچیاں۔ لبوں پر لگانے کے لیئے خاص قسم کے موم روغن مختصر یہ کہ ایک دوکان سی سجی ہوئی نظر آئے گی۔ اور یہ تمام چیزیں محض اس لیئے مہیا کرنا پڑتی ہیں۔ کہ شجرہ تو ان کے گلے میں لٹکایا نہیں جا سکتا صورت ہی سے شرافت برسائی جا سکتی ہے۔ کہ دیکھنے والے ایک ہی نظر میں بھانپ لیں کہ ہاں یہ ہیں۔ نجیب الطرفین شاہین بچے۔

اس طرح تو صاحب ان شاہین بچوں کو پروان چڑھایا گیا ہے اور مرزا صاحب

سے جو پوچھا کہ بڑے بچے کو آخر کس کام سے لگایا جائے کالج سے نکلنے والا ہے۔ تو عقلمندی ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔ کہ

قبلہ میری تو یہ رائے ہے کہ ایر فورس میں بھجوا دیجئے۔

ایر فورس کا نام سنکر ہوش اُڑ گئے۔ یعنی ہوائی جہاز کی نوکری چہ خوش۔ عرض کیا۔ مرزا صاحب میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی رائے طلب کی تھی۔ کہ آپ ماشاء اللہ خود صاحبِ اولاد ہیں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر مشورہ دیں گے۔ مگر آپ نے تو عجیب بات فرمائی ہے؟

مرزا صاحب نے اسی استغنا سے فرمایا۔ میں نے تو اپنے نزدیک بہترین مشورہ دیا ہے۔ صاحبزادے کی ماشاء اللہ صحت بھی اچھی ہے۔ چشم بد دور ہاتھ پیر کے بھی اچھے ہیں۔ ان کے لئے ایر فورس میں ترقی کے بڑے امکانات ہیں۔ اور اگر سچ پوچھئے تو ہمارے ایر فورس میں ایسے ہی نوجوانوں کی ضرورت ہے۔

عرض کیا۔ ترقی گئی بھاڑ میں مرزا صاحب ذرا غور تو فرمائیے کہ میں اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھلا کیونکر ایر فورس میں جھونک سکتا ہوں کہ جاؤ بیٹا اپنی جان سے دور اُڑ جاؤ۔ ہے ہے تصور کرکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ طرح طرح کے ہول آنے لگتے ہیں۔ یہ آپ نے کیا مشورہ دیا ہے؟

مرزا صاحب نے فرمایا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کس قدر فرسودہ تخیل ہے۔ آپ کا بھی۔ اے جناب اب وہ زمانہ گیا۔ جب ان لاڈلوں کو روئی کے گالوں میں پٹاری کے

انگوٹھی کی طرح سینت سینت کر رکھا جاتا تھا۔ اب آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے ذمہ دار شہری ہیں۔

گھبرا کر عرض کیا۔ دیکھو بھئی مرزا۔ اولاد کے معاملہ میں تو یہ سیاسی باتیں مجھ سے کرو نہیں۔ مجھے ہوتی ہے۔ اُلجھن۔ میں سیاست کا بس اتنا ہی قائل ہوں کہ جتنا چاہو مجھ سے چندہ لے لو۔ کوئی مر جائے کالی شیروانی پہنا دو۔ مجھ کو کوئی سیاسی جشن ہو گھر پہ چراغاں کرنے کو میں موجود ہوں۔ مگر چندے میں اولاد نہیں دے سکتا۔ یہ آپ نے کیا منہ بھر کہہ دیا کہ ایئر فورس میں بھیج دوں۔

مرزا صاحب پھر بھی قائل نہ ہوئے۔ جُوتوں سمیت آنکھوں میں گھس کر بولے۔ بندہ نواز اب یہ خود نگرانی اور خود شناسی کا دَور ہے۔ اب قوم کا ہر فرد سپاہی ہے۔ مِلّت کا ہر نوجوان ملّت کے مقدّر کا ستارہ ہے۔ اگر آپ اسی طرح ان شاہین بچوں کو ممولا بنائے رکھیں گے۔ اور شہباز بننے سے روکیں گے۔ تو آخر ہمارا مستقبل کیا ہو گا۔

اُلجھ کر عرض کیا۔ خیر میں آپ سے بحث تو کرنا نہیں چاہتا۔ میں تو یہ پوچھ رہا تھا کہ ان کے لئے وکالت اچھی رہیگی۔ یا ڈاکٹری۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ ڈاکٹری بھی اچھی ہے۔ اس وقت ہم کو ڈاکٹروں کی بیحد ضرورت ہے۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنا ان بزرگوں کا فرض ہے۔ جو اپنے بچوں کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانے کی استطاعت رکھتے ہیں!

عرض کیا۔ ڈاکٹری کے فوائد تو میں خود جانتا ہوں۔ نہایت شریف پیشہ ہے۔ اور اگر چل نکلی ڈاکٹری تو دولت قدم بھی چومے گی۔ مگر قباحت یہ ہے کہ صاحبزادے واقع ہوئے ہیں۔ نہایت کمزور دل کے۔ ایک مرتبہ مرغ ذبح ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اب سے دور ایک ہفتہ تک بخار آتا رہا۔ سوتے میں اچھل اچھل پڑتا تھا۔ ڈاکٹری میں چیر پھاڑ کیسے کریں گے۔ اور بھئی سنا ہے۔ کہ لاشوں کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے۔"

مرزا صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں یہ تو ہے۔ مگر اس میں مضائقہ کیا ہے۔

عرض کیا۔ جو مضائقہ ہے۔ اس کا افسوس یہ ہے۔ کہ تم سمجھ ہی نہیں سکتے بہر حال ڈاکٹری سے تو باز آیا میں رہ گئی وکالت ویسے تو اس پیشہ میں کوئی خرابی نہیں مگر ایک بات سے ذرا ڈر لگتا ہے۔ کہ اگر خدانخواستہ وکالت نہ چلی اور صاحبزادے بن گئے کچھ لیڈر وِیڈر تو میں کیا کروں گا۔"

مرزا صاحب عقل کے ذرا اجبنی ہی سے لوگ ہیں۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ تو اور کیا چاہیئے۔ آپ کو اگر صاحبزادے لیڈر بن جائیں۔ اور ان کو عوام اپنا رہنما تسلیم کر لیں تو اس سے زیادہ آپ کے لئے باعثِ فخر اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔

سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔ میاں بات سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ لیڈر کوئی یونہی نہیں بن جاتا۔ اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ صرف زندہ باد ہی کے نعرے بلند نہیں ہوتے مردہ باد کے نعرے بھی ہم نے سنے ہیں۔ صرف پھول ہی نچھاور نہیں کئے جاتے۔ جوتے بھی اچھالے جاتے ہیں۔ خوش آمدید ہی نہیں

کہا جاتا۔ واپس جاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ جلوس ہی نہیں نکلتا۔ کالی جھنڈیاں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ خیر یہ سب کچھ بھی سہی مگر لیڈر بننے کے لئے پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑتے ہیں کبھی کبھی اور شیطان کے کان بہرے جیل میں چکی بھی پیسنا پڑتی ہے۔ بس میں ان ہی باتوں سے ذرا ڈرتا ہوں۔ اور چونکہ میں نے وکیلوں بیرسٹروں ہی کو زیادہ تر لیڈر بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا وکالت سے کچھ دل کھٹا سا ہو گیا ہے۔"

مرزا صاحب نے گویا مسکرا کے فرمایا۔ "اس قسم کے اندیشے تو کم و بیش ہر مشغلہ میں موجود ہیں۔ اور یہ نشیب و فراز تو عملی زندگی میں ہر ایک کے لئے موجود ہیں۔ زیادہ محتاط طریقہ تو یہ تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان صاحبزادوں کو پیدا ہی نہ کیا جاتا۔"

عرض کیا خیر اب تو پیدا ہو ہی گئے ہیں۔ لہٰذا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں کہتا ہوں کسی مقابلہ کے امتحان میں کیوں نہ بٹھا دوں۔

مرزا صاحب نے کہا "بڑا اچھا خیال ہے۔ مگر ان امتحانوں میں بھی اس قسم کی خطرناک وادیوں سے گذرنا ہی پڑے گا۔ مثلاً پولیس کی ملازمت کو آپ کیا سمجھتے ہیں۔"

کانوں پہ ہاتھ رکھ کر عرض کیا۔ اجی توبہ کیجئے مرزا صاحب ہتھیلی پہ جان لئے پھرتے ہیں۔ یہ بیچارے پولیس والے ایسی بھی سرفروشی کیا کہ انسان واقعی سر

کاٹ کر بیچنا شروع کر دے۔ ایک سے ایک خونخوار بدمعاش سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔ پھر یہ کہ ایسی سخت ڈیوٹی کہ نہ دن کو دن سمجھو نہ رات کو رات۔ صاحب آدھی آدھی رات تک تو یہ پولیس والے گشت لگاتے پھرتے ہیں۔ بلوہ ہو جائے تو گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر جاؤ۔ ان صاحبزادے نے تو آج تک شب برات کی آتش بازی بھی اپنے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑی۔ یہ پستول کیونکر چلا پائیں گے۔ اور اس قسم کی بے شمار باتیں ہیں جن کو میں مناسب نہیں سمجھتا۔ مثلاً گھوڑے کی سواری کو میں نہایت غلط سمجھتا ہوں۔ یا گھوڑے کی جگہ یہ وہ جو موٹر سائیکل آجکل نکلی ہے وہ اور بھی خطرناک۔

مرزا صاحب نے پھر چٹکیوں پر اڑایا۔ اگر پولیس آفیسر ڈولی میں بٹھا کر دیں۔ اور وردی میں چوڑیاں بھی ہوں۔ تو غالباً کوئی مضائقہ نہ ہوگا!

جل کر عرض کیا۔ برادرم آپ تو خیر مذاق فرما رہے ہیں۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ میرا دل ایسا مضبوط نہیں ہے کہ اس بچہ کے لئے میں ایسی ملازمت کو موزوں سمجھوں جس میں بس بدمعاشوں ہی سے واسطہ پڑے خواہ وہ بدمعاش انسان ہوں یا بدمعاش گھوڑے۔ مجھ کو تو اس کے لئے ایسے مشغلہ کی ضرورت ہے۔ جس میں امن و امان کے ساتھ زیادہ نہیں تو بس اتنا پیسہ مل جائے۔ کہ جس طرح کی زندگی میں نے اس کو بسر کرائی ہے۔ وہ خود بھی بسر کر سکے۔

مرزا صاحب بولے۔ بندہ پرور آپ نے تو بچوں کو مرزا پھویا بنا کر رکھ دیا ہے۔

اب وہ زمانہ آلگا ہے۔ کہ مردوں کو مرد بن کر رہنا پڑے گا۔ وہ گہوارں میں جھولنے کا زمانہ گیا۔ اب آپ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں۔ اور قوم کی یہ آزادی اسی وقت تک برقرار رہ سکتی ہے۔ جب تک قوم کے ہر فرد میں اس آزادی کے تحفظ کا صرف جذبہ ہی نہیں۔ بلکہ بل بوتا بھی موجود ہے۔ ہر شخص ملّت کا جانباز سپاہی بن کر رہے گا۔ اب ملّت کے افراد موت سے ٹکرا ٹکرا کر زندگی کے حقوق حاصل کریں گے۔ یہ عمل پیہم کا زمانہ ہے۔ یہ جد و جہد کا دور ہے۔ یہ ہم کو تلافی مافات کا موقع ملا ہے۔ اور اگر اس وقت بھی ہمارا یہی عالم رہا۔ جو آپ کا میں دیکھ رہا ہوں تو پھر خدا ہی حافظ ہے ہمارا۔

عرض کیا۔ بھائی جان آپ تو یہ باتیں کچھ کتابوں کی دنیا کی کر رہے ہیں۔ اس قسم کی باتیں کتابوں میں تو خیر پڑھی جا سکتی ہیں۔ مگر ان پر عمل ذرا مشکل سے ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب بات کاٹ کر بولے۔ عمل کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ کے سامنے ہی مثال موجود ہے۔ کہ میں نے اپنے دو بڑے بچّوں کو نیوی میں بھیج دیا ہے۔ دو چھوٹے بچے ایئر فورس کے لئے تیار کر رہا ہوں۔ آخر ان بچّوں کو بھی میں کہیں سے اُٹھا تو نہیں لایا تھا۔ اولاد ہی تو ہیں۔ مگر میں اولاد کے ساتھ جو بہتر سے بہتر سلوک کر سکتا تھا۔ وہ یہی تھا جو میں نے کیا۔

عرض کیا۔ یہ سلوک کیا۔ کہ ان کو جان بوجھ کر ایسے محکموں میں بھیج دیا۔ کہ

خدا ہی ان کا حافظ ہے۔ اصل میں یہ بڑی ہی غلطی تھی۔ جو میں آپ سے مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔ جس نے خود اپنے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔ وہ دوسرے کی اولاد کے لئے دل میں کیا درد رکھ سکتا ہے۔"

مرزا صاحب نے پھر بتانے کی کوشش کی۔ "میری رائے میں تو آپ صاحبزادوں کو ایک ایک دودھ کی شیشی خرید کر ایک ایک کھلائی کے سپرد کر دیں۔ کہ ان کو لوریاں سناتی رہو اس لئے کہ ان ہی کو پاکستان کا امین بننا ہے۔ اور یہی اس آزادی کے محافظ ہوں گے۔

مرزا صاحب تو اس قسم کی جلی کٹی سنا کر تشریف لے گئے۔ عجیب پتھر دل پایا ہے اس شخص نے بھی مگر اب ہر ایک تو ایسا نہیں ہو سکتا بھلا غور تو کیجئے وہ بچے دھوپ میں کمھلا جائیں۔ جو ٹھنڈی ہوا میں چھینکیں لینے لگیں ان کے لئے آپ تجویز فرماتے ہیں۔ ایر فورس۔ پولیس کی نوکری۔ فوج اور سپہ گری۔ سبحان اللہ دروازہ زور سے بند ہو جاتا ہے۔ تو وہ اچھل پڑتے ہیں۔ ننھا سا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بھلا وہ پستول اور بندوق سے کیونکر کھیل سکیں گے۔ اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ کہ اپنے جیتے جی تو یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ ان کو آنکھ بند کر کے جھونک دیا جائے۔ کسی محکمہ میں بلکہ اگر وہ خود اس قسم کا ارادہ کریں بھی تو میں یہی کہوں گا۔ کہ

الغرض آدمی سے جسم تو یوں پالیں
آپ آفت میں جان کو ڈالیں

یہاں زندگی کے لالے پڑے ہیں جی۔ بچپن ہی میں بھی بہت ہے۔ اگر یہی روزگار رہ گئے ہیں۔ تو ان کے لئے بیکاری بھلی۔

آزادی کا شوق

میں آپ سے عرض کروں۔ کہ مجھ کو آزادی کا پہلے پہل کب شوق ہوا ہے؟ یہ ایک تفصیل طلب واقعہ ہے۔ اور میرا جی چاہتا ہے کہ یہ تفصیل پیش ہی کروں۔ خواہ آپ زندگی سے یا کم از کم مجھ سے بیزار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ مگر ہو جانے دیجئے میرا یہ شوق پورا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ میں ذرا اپنے سسرال جا رہا تھا۔ سسرال سے میرا مطلب یہ ہے کہ میری شادی تو خیر اب تک وہاں ہوئی نہیں۔ مگر نسبت بالکل طے تھی اور میری آؤ بھگت بڑے زور شور سے ہو رہی تھی۔ یہ بات تو آپ کو معلوم ہی ہوگی کہ جس شخص کی شادی ہونے والی ہوتی ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی زمین پر چلے

نگر پیر آسمان پہ ہی پڑتے ہیں۔ بات یہ ہے ناکہ اس کو ایک دم یہ احساس ہوتا ہے۔ کہ اخاہ ہم بھی کسی قابل ہیں۔ پھر سسرال والے کچھ اس طرح دیدہ و دل فرش راہ کرتے ہیں کہ اگر آدمی ذرا بھی بے وقوف ہو۔ تو پیغمبری کا دعویٰ کر بیٹھے۔ عرض کرنے کا مطلب یہ کہ کچھ اسی قسم کے اشرف المخلوقات ہونے کے وہم میں ان دنوں میں بھی مبتلا تھا۔ اور بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر سسرال پہنچا کرتا تھا۔ جامہ زیبی بھی اس زمانے میں مجھ پر ختم تھی۔ آرائشِ جمال کے لئے کیا کیا جتن کئے جاتے تھے۔ اور مقصد ہوتا تھا صرف یہ کہ ہونے والی سسرال جانا ہے۔ خیر یہ تو بات سے بات نکل آئی۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ میں ذرا سسرال جا رہا تھا۔ بال بال موتی پروئے سولہ سنگھار بتیس پٹیا کئے کہ ایک چوراہے پر معمولی سے ایک کانسٹیبل نے ہاتھ پھیلا کر مجبور کر دیا کہ بائیسکل سے اتر پڑوں۔ کاش یہ کانسٹیبل ذرا میری ہونے والی سسرال تک زحمت کرتا اور اندازہ کر سکتا کہ جس عظیم المرتبت شخصیت کو اس نے اس رعونت سے روکا ہے وہ کس پایہ کا انسان ہے۔

بہر حال سائیکل سے اترنا پڑا۔ اور اب اس روکے جانے کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ دوسرے ایک ولایتی گورا اپنی بائیسکل پر آرہا تھا۔ کیوں صاحب کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ مجھ کو گذر جانے دیا ہوتا۔ اور اس گورے کو جو اپنی سسرال بھی نہیں جا رہا تھا۔ روک لیا جاتا۔ بائیسکل سے اترنے کے بعد زندگی میں پہلی

مرتبہ اس خیال نے انگڑائی لی کہ یہ گورا مجھ سے زیادہ معزز ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں میری حیثیت صرف یہ ہے۔ کہ میں اس کے لئے رکا جاؤں۔ اس لئے کہ میں غلام ہوں اور وہ آقائی کرنے والی قوم کا ایک فرد ہے۔ خیال تو بڑا باغیانہ تھا۔ مگر اس کانسٹیبل بیچارے کو کیا معلوم کہ یہ راہگیر اس وقت اس قسم کی باتیں سوچ رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ جب وہ گورا نہایت بازاری انداز سے سیٹی بجاتا ہوا اپنی بائیسکل پر گذر گیا۔ تو کانسٹیبل صاحب نے گھوم کر مجھ کو بھی اس ادا سے گذرنے کا اشارہ کیا۔ گویا سرکار گذر گئے ہیں۔ اب درباری بھی سڑک پار کر سکتے ہیں۔ میں سڑک تو خیر پار کر گیا۔ مگر اب دماغ میں اسی قسم کے خیال ابل رہے تھے کہ سات سمندر پار کی قوم یہاں آکر ہم پر اس طرح حکومت کرے کہ ہماری ہی سڑک۔ ہمارا ہی بھائی کانسٹیبل اور حکم چل رہا ہے اس گورے کا۔ مقدم ہے وہی منہ سے سیٹی بجا بجا کر بائیسکل چلانے والا گورا جس کی چقندر نما بانہوں پر اودے اودے خوفناک سانپ اور اژدہے گدے ہوئے تھے۔ مگر اس کے باوجود کیا دبدبہ تھا۔ کیا خود اعتمادی تھی۔ اور کس فاتحانہ شان سے وہ گذر رہا ہے۔ اور کس غلامانہ عجز سے مجھ کو دیکھنا پڑا ہے۔ اس کا یہ تحکم۔ کچھ غصہ کچھ غیرت اور زیادہ تر حماقت میں مبتلا۔ احتجاجاً بائیسکل پر سوار نہیں بلکہ بائیسکل کو ٹہلاتا ہوا ان خیالات میں چلا جا رہا تھا۔ کہ ادھر سے آنکلا ایک جلوس نعرے بلند کرتا ہوا "بن کے رہے گا پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان"۔ ایک سبزہ آغاز۔ سبز پوش

سبز علم لئے ہوئے صاحب بہادر سے قریب ہی آ کر جاں پر کھیل کر چیخے "آزادی" اور بے شمار آوازوں سے ایک آواز میں کہا "یا موت" چوٹ کھایا ہوا دل تو تھا ہی۔ میں نے بھی دل ہی دل میں کہا "واقعی آزادی یا موت"۔ اور اس آزادی یا موت نے ایسا گھیرا۔ کہ اب میں بھی اس سمندر میں ایک قطرہ بن کر گرا۔ اور سمندر بن گیا۔ سسرال جانے کے بجائے اب میں اس جلوس کے ساتھ اس میدان میں پہنچ گیا جہاں جلوس یکایک جلسہ بن گیا۔ اللہ اکبر۔ پاکستان زندہ باد۔ آزادی یا موت وغیرہ کے نعرے بلند ہوئے۔ اور پھر جو تقریریں شروع ہوئی ہیں تو رات کو گیارہ بجے میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا یہ غور کر رہا تھا۔ کہ آزادی ملنے کے بعد بیوی کو سہاگن بنانا مناسب رہے گا۔ یا آزادی ملنے سے پہلے ہی بیوی کو بیوہ بنانا ٹھیک رہے گا۔ اس قسم کی باتیں فوراً تو طے ہوا نہیں کرتیں۔ بڑی کشمکش میں مبتلا ہونا پڑتا ہے انسان کو مگر اس گورے والے واقعہ نے وہ کاری ضرب لگائی تھی۔ کہ پھول کی پتی سے پتھر کا جگر کٹ چکا تھا۔ اور مجھ ایسے مردِ ناداں پر بھی اس کا کلام نرم و نازک اثر کر چکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صبح میں مسلم لیگ کے دفتر میں تھا۔ اور کوشش یہی تھی کہ ان لوگوں کو مجھ کو ابھی اپنے کندھوں پہ اٹھا کر میرا جلوس نکالیں۔ ورنہ کم سے کم جلسہ کمیٹی ہی کا عہدہ بنا دیں۔ مگر جگہ ملی فی الحال رضاکاروں میں وہ بھی اس شرط پہ کہ اپنی وردی میں خود بنواؤں۔ چنانچہ منظور کر لی یہ شرط بھی اور آزادی کی جدوجہد میں ایک ادنےٰ سپاہی کی حیثیت سے شامل ہو گئے۔ اس لئے کہ مقصد دراصل کوئی عہدہ

یا مرتبہ نہ تھا۔ بلکہ آزادی تھی۔ لیجئے صاحب اب شروع ہو گئیں قومی سرگرمیاں۔ آج اس جلوس میں شرکت کرنا ہے۔ کل اس جلسہ میں ڈیوٹی ہے۔ آج یہاں پہرہ دے رہے ہیں۔ کل وہاں قواعد کر رہے ہیں۔ مگر دل کو یہ اطمینان ضرور تھا۔ کہ یہ سب کچھ حصولِ آزادی کے لئے کر رہے ہیں۔ سب سے بڑا امتحان جو دینا پڑا وہ یہ تھا ایک جلسہ میں سبز وردی پہنے ڈنڈا ہاتھ میں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ کہ ہمارے ملانے خسر صاحب جو ادھر سے گزرتے ہیں۔ تو اپنی بیٹی کے مجازی خدا کو بخدا کا دیکھو کر سکتے کے عالم میں آ گئے۔ پہلے تو کچھ دیر تک بول ہی نہ سکے۔ اس کے بعد بمشکل تمام صرف یہ فرمایا۔

"میاں یہ تم ــــــ"

عرض کیا "جی ہاں" بات یہ ہے کہ۔

ہر ذرہ ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

وہ ٹھہرے آنریری مجسٹریٹ۔ خطاب کے لئے کلکٹر نے بھیج رکھی ہے سفارش وہ اس چاند ستارے کو بھلا کیا جانیں۔ ان کے جانی دشمن۔ کچھ تحیّت شش و پنج کے عالم میں بولے "اور اگر آپ کے والد صاحب قبلہ کو اس کی خبر ہو گئی تو؟"

یہ تو میں نے بھی نہ سوچا تھا۔ کہ واقعی اس اطلاع کے بعد والد صاحب خودکشی کر نامناسب سمجھیں گے۔ یا مجھ کو ہی عاق کر کے دنیا کا فانی سمجھ کر صبر کر لیں گے۔ البتہ اس وقت میں یہ غور کر رہا تھا۔ کہ ملت کا یہ تارا کا بیتا زیادہ بڑا ہے یا کسی کلب میں

بُرج کھیلتے ہوئے پایا جاتا۔ مجھ کو غور کرتا ہُوا چھوڑ کر خسر صاحب تو روانہ ہو گئے۔ مگر دوسرے ہی دن "خسر شپ" کا اُنکا استعفےٰ آگیا۔ اور والد صاحب قبلہ کو انہوں نے صاف صاف لکھ بھیجا۔ کہ جس عالم میں کل آپکے بلند اقبال نظر آئے ہیں۔ اس کے بعد مجھ سے آپ کو یہ اُمید نہ ہونا چاہیئے۔ کہ میں ان کو اپنا داماد بنا سکوں گا۔ والد صاحب پہنچے۔ والدہ بیچاری روئیں۔ اور آخر دونوں کی متفقہ رائے سے یہ تجویز منظور ہو گئی۔ کہ ایسی اولاد آپ ہوتے ہی مر جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس تجویز میں ایک خامی یہ تھی۔ کہ یہ طے نہ ہو سکا۔ کہ اگر یہ اولاد نہ مرے بلکہ ہوتے ہی تو اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ جھگڑا یہ پڑ گیا تھا۔ کہ والد صاحب تو اب بھی گولی مار دینے کی تائید میں تھے۔ خواہ اس کار خیر کے لئے کسی کی بندوق ہی کیوں نہ چرانا پڑے۔ مگر والدہ صاحبہ کا نعرہ یہ تھا۔ کہ کھوٹا پیسہ اور نالائق اولاد وقت پر کام آ ہی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی میں اپنا کام بن گیا۔ ورنہ آج شہیدانِ ملت میں اپنا شمار بھی ہوتا۔

نسبت کے چھوٹنے اور والد صاحب کو ناراض کرنے کے بعد اب تو اور بھی آمادہ تھے۔ دوسرے یہ بات ذہن نشین ہو چکی تھی۔ کہ منزل لیلیٰ کے لئے شرطِ اوّل مجنون بننا ہے۔ ایسے ایسے خدا جانے کتنے امتحان دینا پڑیں گے۔ چنانچہ اب ہر طرف سے خالی الذہن ہو کر میں تھا اور قومی خدمت۔ آج یہاں لاٹھی کھائے ہیں۔ کل ہار ڈنڈوں کی دعوت ہے آج اس جلسہ میں پولیس نے مارتے مارتے بھرتہ کر دیا۔

کل اس جلسہ سے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ اور شہر کے باہر لے جا کر چھوڑ آئی۔ قصہ مختصر یوں ہوتا ہے کچھ اکثر بچے بہت کم۔ اور وہ دن کے لئے جیل بھی ہو آئے۔ یہاں تک کہ اسی عالم میں چودہ اگست ۱۹۴۷ء آ گئی۔ اور ہمارا نعرہ یکایک واقعہ بن گیا۔ دل نے کہا۔

مورے میاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا

مگر ابھی خوشی بھی نہ ہونے پائے تھے۔ کہ ایک تبسم نے لاکھوں آنسو نچوڑ لئے۔ یہ ایک مسرت سینکڑوں غموں کے معاوضہ میں ملی۔ معلوم ہوا۔ کہ قومی رضاکار اب بننا ہے کہ جو لوٹے جا رہے ہیں ان کو بچائیں۔ جہاں آگ لگی ہے وہاں سرفروشانہ اپنے کو جھونکنا ہے۔ اپنے کو نہیں دوسروں کو بچانا ہے۔ منزل سامنے ہے مگر عبور کرنا ہے خون کے سمندر۔ آگ کے جہنم۔ بلکتے ہوئے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ماؤں کی چیخوں کو سنی ان سنی نہیں کر سکتے۔ زخمیوں کی کراہوں کو روند کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سب کو لئے ہوئے بڑھے۔ جو پاس تھا۔ وہ زخم دینے والوں کو دیا۔ پاکستان پہ سب کچھ نچھاور کرتے ہوئے، دونوں ہاتھوں سے اپنے کو لٹاتے ہوئے، زخموں سے چور، مگر مسرور۔ اللہ اکبر کی گونج اور خود نگری کے نشہ میں جھومتے ہوئے والہانہ اپنی منزل کی طرف بڑھے۔ غلامی نے سرحد تک تعاقب کیا۔ کہ اسے وفاداریوں کی رسم توڑ کر کہاں جاتے ہے۔ مگر آخر اپنی آزاد مملکت میں پہنچ گئے۔ جو کھویا تھا یک لخت بھول گئے۔ معلوم ہوا سب کچھ پا گئے۔ زخموں سے

چھوڑ رہے تھے۔ فاقوں سے نڈھال تھے۔ خون رُلانے والے مناظر دل پاش پاش کئے دیتے تھے۔ مگر اب دل کو اطمینان تھا کہ سب کچھ لُٹ گیا۔ نقصان کا دور گزر گیا۔ تلافی کا وقت آپہنچا۔ چنانچہ ہم اپنے اپنے نیلے اُودے بھوری اور سیاہیوں کے نقوش لئے ہوئے گورے سپاہیوں کو جابجا کہیں تنگ کرتے رہتے تھے۔ اور اب ہم ان پر فاتحانہ نظر ڈال رہے تھے۔

رفتہ رفتہ ایک سال گزرا۔ دوسرا گزرا اور تیسرا بھی گزر گیا۔ حالات پہلے معمول پر آئے۔ پھر تعمیری سرگرمیوں نے غیر معمولی صورت اختیار کرلی۔ زخم بھی مندمل ہوگئے۔ اور بچھڑے ہوئے بھی مل گئے۔ تو اب پھر اپنا کنوارپن یاد آیا۔ ارادہ ہوا کہ اب شادی کرلیں۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ مگر نظر سے کام نہ بنا۔ آخر ایک دوست ہی کام آئے۔ اور ایک جگہ سلسلہ جنبانی کردی۔ یہ بڑا شریف گھرانہ ہے بڑے وضعدار مسلمان ہیں یہ لوگ۔ اور سُنا ہے کہ صاحبزادی کو خدا نے گویا بیٹ ہونے سے بال بال بچایا ہے۔ صرف چند مہینوں سے فیل ہوئی ہیں۔ صورت شکل سُنا ہے بہت اچھی ہے۔ فرشتہ خصلت، مجسمۂ عصمت و عفت اور خدا جانے کیا کیا ہیں۔ مجھ کو آج ہی اُن کے یہاں دیکھنے کو بلایا گیا تھا۔ چنانچہ جب میں پہنچا ہوں۔ تو وہ بزرگ جن کا تقدس ایک فرلانگ سے نظر آرہا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے بڑھے۔ وظیفہ ملتوی فرمایا۔ اور نہایت شفقت سے اپنے ساتھ اپنے جنت نظیر ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ادھر ادھر کی باتیں

باتیں کر کے فرمایا۔

"صاحبزادے اور تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ مگر آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ گویا مہاجر ہیں۔"

عرض کیا۔ قبلہ میں تو اپنے کو مہاجر نہیں کہتا ہوں تو سچ پوچھئے دشت غربت سے وطن آیا ہوں۔ یہ میرا گھر ہے۔ میں نے سپاہیانہ عزم اور ہمت کے ساتھ اس کو فتح کیا ہے۔ میں اس کا فاتح ہوں۔"

بڑی متانت سے بولے یہ درست ہے مگر مہاجر ہی ہوئے نا آپ۔ اور میرے واسطے مصیبت یہ ہے کہ دنیا بھی کہے گی۔ کہ میں نے اپنی لڑکی ایک مہاجر کو دے دی۔"

حیرت سے پوچھا۔" تو گویا یہ بری بات ہے۔"

بڑے اللہ والے بن کر بولے۔ یہ تو میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ جبکہ مہاجر نوازی ہمارا مذہب ہم کو سکھاتا ہے۔"

بات کاٹ کر عرض کیا۔" بلکہ مہاجر اور انصار کو ایک رشتہ میں ——"

وہ بھلا بات کیوں نہ کاٹتے۔" جی جی وہ میں سمجھ گیا۔ مگر یہ خوردار یہ برادری والے نہایت نامعقول ہوتے ہیں۔ کس کس کی زبان بند کرونگا میں ——"

اور جب مجھ کو بہت مایوس دیکھا تو جھوٹ موٹ بول دیئے۔ بہرحال میں

غور کروں گا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ آپ سے مل کر بیحد مسرت ہوئی ہے۔

کاش ان کو معلوم ہوتا۔ کہ مجھ کو ان سے مل کر کس قدر "مسرت" ہوئی۔ مگر میرے دوست نے بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ کہ بھائی تم کو آزادی کا شوق تھا۔ وہ پورا ہوا۔ پھر کیوں اپنی اس آزادی کو دائمی غلامی سے بدل رہے ہو۔ گورے کی غلامی سے بیزار اور گوری کی غلامی کے لئے بیقرار۔ سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔

لیاقت نہرو معاہدہ

اب تک صرف ایک مطلع ہوا تھا اور عالم یہ تھا کہ طرح سے عجیب متلی سی آ رہی تھی۔ غالباً اسی لئے غیر طرحی مشاعرے رواج پاتے چلے جا رہے ہیں بلکہ میں تو نظمِ معرّا کے وجود میں آنے کا باعث بھی اسی کو سمجھتا ہوں کہ ہمارے بانیانِ مشاعرہ طرح تجویز کرنے میں کبھی خوش مذاقی سے کام نہیں لیتے ایسی بیہودہ طرح بعض اوقات دے دیتے ہیں کہ شعر کہنے کے بجائے شعر کا شت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ اب کوئی پوچھے یہ بھی کوئی شریفانہ مصرعہ ہے کہ ۔۔

چراغِ گورِ غریباں جلے جلے نہ جلے

قافیہ ہے آخری جلے گویا طرح ہے غیر مردّف۔ نتیجہ یہ کہ گھوم پھر کو یہی مصرعہ

ذہن میں آتا ہے کہ ۔ ع ۔

رقیب وال یہ تیری گلے گلے نہ گلے

بھی ہوتی ہیں وہ طرحیں کہ شاعر کو دانتوں پسینہ آجائے اور وہ توبہ کرلے ہمیشہ کے لئے شعر کہنے سے ۔ رات کو ہے مشاعرہ اور اب تک صرف ایک مطلع ہوا ہے ۔ باقی اشعار کے لئے اپنے کو ٹہلا رہے ہیں پر آمد سے ہیں اِدھر سے اُدھر پان پر پان چبا رہے ہیں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے ہیں مگر توبہ کیجئے آمد تو آمد یہاں تو آورد تک کا پتہ نہیں ۔ جی چاہتا ہے کہ اپنی اور باقی مشاعرہ کی جان ایک کر دیں ۔ پھر اُن حضرت کے اس چیلنج کا خیال کہ آج مجھے دیکھنا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے ۔ گویا براہ راست معاملہ ٹھہرا عزّت آبرو کا کہ یا تو غزل کہو ورنہ خودکشی کرو حالانکہ ایسی طرحوں میں غزل کہنا بھی خودکشی ہی کی ایک قسم ہے ۔

ایسا شدید معرکہ درپیش ہے اور دیکھتے کیا ہیں کہ بندہ وغارہ ایک ہاتھ میں اخبار لئے تشریف لا رہے ہیں ۔ ارادہ ہی کیا تھا کسی درخت کی آڑ میں چھپ جائیں کہ اُن حضرت نے گولی مار دی " السّلام علیکم مولانا "

عرض کیا " انّا للہ و انّا الیہ راجعون "

کہنے لگے " مولانا ۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سارا قصہ ہی ختم ۔ آج کی خبروں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر بھاڑ چھیڑ گئے ہیں

اب تو میرے خیال میں تمام قصے قضیے طے ہو جائیں گے "

عرض کیا "بھئی خانصاحب بات اصل میں یہ ہے کہ رات کہے ہے مشاعرہ اور آپ کے سر عزیز کی قسم سوائے ایک پچر سے مطلع کے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ طرح بھی عجیب گڑھب ہے "

خانصاحب نے گویا اس کو غیر ضروری بات سمجھ کر فرمایا "اجی جہنم میں گیا آپ کا مشاعرہ۔ یہاں جان نکلی جا رہی ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ محبت بڑھتے بڑھتے واقعی مصالحت بن گئی تو کیا ہوگا ؟"

اب ہم نے بھی واقعی مشاعرے کو جہنم میں ڈال کر اس لفظ خدانخواستہ پر غور کیا اور حیرت سے پوچھا "آپ فرماتے ہیں خدانخواستہ یعنی آپ کے خیال میں مصالحت اور دوستی وغیرہ نہ ہونا چاہیئے "

خانصاحب نے بڑی تشویش سے فرمایا "صاحب بڑی گڑبڑ پڑے گی اس میں اور اگر حالات نصیب دشمناں بے حد خوشگوار ہو گئے تو قیامت آجائے گی قیامت ۔ آپ اس کو معمولی بات نہ سمجھیں "

اور واقعی ہم اس کو معمولی بات نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے کہ جہاں تک خانصاحب کا تعلق ہے ان کے لئے اس سے بڑا حادثہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں ممالک میں اس حد تک مصالحت ہو جائے کہ مہاجرین ادھر سے واپس جائیں شرنارتھی اُدھر سے واپس آئیں اور جائدادوں کے تبادلے

وغیرہ ہونے لگیں۔ بات یہ ہے کہ جہاں تک خانصاحب کی جائداد کا ہم کو علم ہے
آپ جو کچھ چھوڑ کر آئے ہیں اُس میں سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ بیلوں کی جوڑی
تھی جس کا دور دور جواب نہ تھا۔ ان میں سے ایک بیل تو وہ تھا جس کی
سلور جوبلی تک ہو چکی تھی اور باقی تمام بیل اس بزرگ بیل کا بیحد احترام کرتے
تھے اور زبان تو خیر ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی مگر نگاہوں سے پتہ چلتا تھا کہ
اس محترم بیل کو سب چچا چچا کہہ رہے ہیں۔ دوسرا بیل اگر لنگڑا نہ ہوتا تو خانصاحب
کا بیان یہ ہے کہ لارڈ لنلتھگو اُس کو اپنے ساتھ ولایت لے جاتے۔ اس
بیلوں کی جوڑی کے علاوہ ایک تاریخی حقہ۔ دو چار پائیاں۔ چار پانچ گھڑے
مختصر یہ کہ نہ جانے کیا کیا چیزیں اُسی طرف رہ گئیں۔ پھر اپنا ذاتی مکان۔
ہر چند کہ مکان کی زمین سرکاری تھی مگر اُس پر چھپّر تو اپنا ہی تھا۔ اور لیجیے
سب سے اہم چیز تو ہم بھولے ہی جاتے تھے اس چھپّر کے سامنے ہی ایک
کنواں تھا۔ جس کا میٹھا اور ٹھنڈا پانی خدا جانے اب کون کون مالِ مفت سمجھ
کر لنڈھا رہا ہوگا۔ مگر خانصاحب کو ایمان کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کسی
چیز کے چھوٹنے کا اب خیال بھی نہیں ہے اور وہ صبر و قناعت کے ساتھ
ایک ایسے مکان پر قابض ہیں جس میں کنواں نہ سہی کمیٹی کا نل موجود ہے۔
چھپّر نہ سہی رنگین نقش و نگار کی چھتیں ہیں ہر کمرے میں بجلی کی روشنی ہے۔ دو
کمروں میں پنکھے بھی لگے ہوئے ہیں۔ وہ بانس کی ہلکی پھلکی چار پائیاں جن کو پھول

کی طرح جب چاہے اُٹھا کر باہر لے جاؤ اور جب چاہو اندر لے آؤ وہ تو خیر
میسر نہ آ سکیں مگر چار نواڑی پلنگ اور دو مسہریاں مل گئی ہیں اور خانصاحب
اُن کو غنیمت سمجھتے ہیں رہ گئیں میزیں اور کرسیاں وہ ہیں تو کس کام کی اور نہ
ہوتیں تو کیا کمی رہ جاتی۔ بہر حال اب خانصاحب یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ اس
گھر سے بھی نکلنا پڑے۔ جس حال میں بھی ہیں خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اپنے
کو بجائے کاشتکار کے دوکاندار ثابت کر کے ایک چھوٹی سی دکان اپنے
نام الاٹ کرالی ہے۔ مکان مل گیا ہے۔ گھر کے علاوہ گنہ ہستی بھی اس
مسبب الاسباب نے عطا کر دی ہے۔ مختصر یہ کہ جو کچھ اُس طرف رہ گیا وہ
تو رہ گیا اُس کو بھلا کر جو کچھ اب حاصل ہے اُسی پر قانع تھے کہ اخباروں
میں لیاقت نہرو معاہدہ اقلیت کی تفصیلات پڑھ کر ہاتھوں کے طوطے
اُڑ گئے کہ اگر یہ معاہدہ واقعی کامیاب ہو گیا اور صلح صفائی کے بعد حالات
ایسے خوشگوار ہو گئے کہ اِدھر کے اُدھر اور اُدھر کے اِدھر ہونا شروع ہو
گئے تو ان حضرت کا کیا بنے گا۔ ظاہر ہے کہ وہاں بھی دیہات پلٹ چکے ہونگے۔
چھپر اُڑ چکا ہوگا۔ سرکاری زمین پر سرکار کا قبضہ ہو گا۔ گھڑے ٹوٹ گئے
ہوں گے۔ حقہ تعصب کا شکار ہو چکا ہوگا۔ مختصر یہ کہ یہ بیچارے تو نہ اِدھر
کے رہیں گے نہ اُدھر کے۔ اُن کی اس تشویش کا پورا احترام کرتے ہوئے
عرض کیا: خانصاحب یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کو یہاں بعض ایسی آسائشیں

حاصل ہو چکی ہیں اور آپ نہیں چاہتے کہ اُن سے آپ کو محروم ہونا پڑے مگر آپ کی ان آسائشوں پہ دو ممالک کے امن و سکون کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔"

خانصاحب نے مونچھوں کے چھپر اُٹھاتے ہوئے کہا "عجیب بات فرمائی ہے آپ نے یعنی مجھ کو کیا آسائشیں حاصل ہوئی ہیں۔ آپ کو معلوم بھی ہے جناب کہ میں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں۔ بھرا ہوا گھر چھوڑ دیا ـــــ"

عرض کیا "وہی گھر نا جس میں پانچ گھڑے اور دو چار پائیاں ـــــ"

بات کاٹ کر بولے "اب آپ کیوں کھلوائیے گا مجھ سے۔ آپ نے کبھی میری زبان سے نہ سُنا ہوگا کہ میں نے یہ چھوڑا اور وہ چھوڑا حقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ جو قسمت میں نہیں تھا وہ چھن گیا اور جو قسمت میں تھا وہ مل گیا۔ زندگی بھر کی کمائی وہ گھر تھا جو اُدھر رہ گیا۔ اب یہاں اس اُجڑے ہوئے گھر کو بسایا ہے تو آپ خود دیکھنے والے ہیں کہ کیا حالت تھی اس گھر کی اور کیا بنا دیا ہے میں نے اس کو جھوٹی والا بجلی کی فٹنگ یہ مجھ لیجئے کہ پھر سے کرائی ہے ـــــ"

عرض کیا "وہ تو خیر میری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک سوئچ آپ نے بالکل نیا منگوا کر لگایا تھا۔"

ـــ بات مل گیا تو دو رشتے کر بولے "اب آپ ہی دیکھ لیجئے۔ اس کے علاوہ پلاسٹر ٹھیک کرانے کے لئے آپ کو یاد ہوگا کہ میں خود کیسٹ لا رہا تھا۔ اسے بھی اُس

روز کا ذکر ہے جب آپ کے یہاں سے کسی بچہ کی سہالگرہ کی مٹھائی آئی تھی میرے یہاں"

ہم کو یاد آگیا کہ واقعی خانصاحب ایک دن اپنے کُرتے کا دامن پھیلائے اور اُس میں سیمنٹ لیئے اس طرح چلے آرہے تھے جیسے کسی نئی نویلی دُلہن کی اللہ رکھے گود بھری گئی ہو۔ اور اُس روز وجہ یہ بتائی تھی کہ بارش کی وجہ سے چھتیں ٹپکنے لگی ہیں تو میں نے سوچا کہ لاؤ اُن کو خود ٹھیک کر دوں۔ زیادہ سے زیادہ دہ چار آنے کا سیمنٹ ہوگا۔ مگر اب اُسی واقعہ کو اس اہمیت کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں اور اضافہ یہ فرمایا کہ "حضور والا میں نے کاریگر لگوائے مزدور کو ڈھونڈھنا پڑا۔ معیبتوں سے گذرکر مرمت کرائی روپیہ ٹھیکری کی طرح لٹایا پانی کی طرح بہایا تب کہیں جاکر گھر رہنے کے قابل بن سکا ہے اور آپ فرماتے ہیں ادنے آسائشیں"

رفع شر کے لیۓ عرض کیا "میرا مطلب یہ تھا خانصاحب کہ آپ نے جو لفظ خدانخواستہ استعمال کیا ہے مصالحت اور صلح صفائی کے امکانات کا اندازہ کرکے وہ بڑا خود غرضی کا لفظ ہے"

خانصاحب نے ایک ماہر سیاست بن کر کہا "حضور والا یہ خود غرضی کی بات نہیں ہے بلکہ یہی خلق اللہ کے فائدے کے لئے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ مجھ کو تو ڈالیئے جہنم میں مگر خدا کی قسم ذرا سوچیئے کہ اس مصالحت سے کتنے بسے گھر پھر سے اُجڑ

جائیں گے۔ کتنے آدمی از سرِ نو خانہ بدوش ہو جائیں گے۔ اور نئے سرے سے ایک آفت بچ جائے گی ——"

عرض کیا، "خانصاحب اوّل تو آپ نے اس معاہدے سے ایک ایسا مفہوم خود بخود اخذ کر لیا ہے جو خود آپ کے لئے تکلیف دہ بنا ہوا ہے۔ دوسرے فرض کر لیجئے کہ یہ معاہدہ واقعی اس حد تک کامیاب ہو جائے کہ اس کے یہ نتائج بھی پیدا ہو سکیں، جو آپ کے ذہن میں ہیں تو یہ نہایت مبارک بات ہو گی۔"

خانصاحب پہلے تو حیرت سے منہ کھولے کے کھولے رہ گئے پھر بمشکل تمام بولے، "تنخوں چنے چبانا پڑیں گے جناب والا۔ مذاق نباشد۔ آپکا کیا ہے ملازم آدمی ٹھہرے ملازمت کہاں جا سکتی ہے۔ یہ ہمارے دل سے پوچھئے کہ کاروبار کا کیا حشر ہو گا۔"

عرض کیا، "خصوصاً وہ کاروبار جو حلوائی کی دکان دادا جی کا فاتحہ کے مصداق الاٹ کرایا گیا ہو۔"

خانصاحب جب لاجواب ہوتے ہیں تو عجیب لاجواب فقرہ استعمال کرتے ہیں کہ "اجی مجھ کو ڈالیئے جہنم میں۔" چنانچہ اس وقت بھی ہر کلا کر یہی جملہ استعمال فرمایا، "اجی مجھ کو ڈالیئے جہنم میں۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ سب کیا دھرا ملیا میٹ ہو کر رہ جائیگا۔ اور پھر سب تتر بتر ہو کر رہ جائیں گے۔"

اب ہم نے خانصاحب کو سمجھانے کی کوشش کی حالانکہ غصہ اتنا آرہا تھا کہ

کاش کوئی خود ہم کو سمجھاتا مگر جب مقابلہ ہو کسی اپنے سے زیادہ جاہل سے تو خود ہی صبر کرنا پڑتا ہے۔ عرض کیا: "خانصاحب۔ جس قسم کے بزرگ آپ ہیں اس قسم کے لوگ ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ اس مصالحت۔ دوستی اور صلح صفائی کا یہ خطرناک پہلو اس وقت ادھر بھی اکثر لوگوں کے ذہن میں ہوگا۔ بات یہ ہے کہ آپ پاکستان اسی کو سمجھتے ہیں کہ آپ کو ایک معقول گھر اور ایک چلتی ہوئی دوکان مل گئی ہے کسی ہندو کی اور وہ سوراج اسی کو سمجھ رہے ہونگے کہ ان کو کسی مسلمان کا گھر اور کسی مسلمان کا کوئی کاروبار ہتھیانے کا موقع مل گیا ہوگا مگر آزادی ان خود غرضیوں سے بلند و بالا ایک بالکل علیحدہ چیز ہے اور دو ممالک کی عافیت اور امن کو ان سستے داموں بیچا نہیں جا سکتا۔ میرا دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ ان حالات پہ ذرا بلند نظری اور فراخ دلی سے غور کیا جائے۔"

خانصاحب نے غالباً بلند نظری سے غور کیا یعنی بڑی قہر آلود نظروں سے ہم کو گھورا اور غالباً فراخ دلی سے اس مسئلہ پہ کچھ سوچا یعنی بغیر کچھ کہے سنے پیر پٹختے ہوئے تشریف لے گئے۔ البتہ ہم کو یہ روگ دے گئے کہ ہم ان کے متعلق اور ان ہی کے ایسے بے شمار پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے متعلق مسلسل یہ سوچتے رہیں کہ یا اللہ کیا ان ہی سب کے لئے یہ بیچارے لیاقت اور نہرو یوں سر کھپاتے پھرتے ہیں۔ مگر چونکہ رات کو مشاعرہ تھا لہذا

ہم نے کہا اس قسم کے لوگ ہر ملک اور ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ مگر اب سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ غصہ کس پہ کریں ایسا کرٹے صاحب مصرعہ طرح دینے والے پر یا ایسے کرٹے صاحب خود غرضوں پر۔ سب سے زیادہ آسان یہ نظر آیا کہ خود اپنے اوپر غصہ کرنا چاہیئے لہذا دانت پیس پیس کر فکر سخن شروع کر دی۔

مُشاعِر

شاعر سُنا تھا۔

متشاعر بھی سُنا تھا۔

ایک سرکاری قسم کے مشاعرے میں مُشاعر" بھی سُن لیا۔

بانیٔ مشاعرہ شعرائے کرام کا شکریہ ادا فرما رہے تھے "میں مشاعر صاحبان کا بیحد شکر گزار ہوں۔ مشاعر حضرات نے بڑی تکلیف فرمائی ہے اس مشاعرے میں چوٹی کے مشاعر جمع ہیں۔ وغیرہ وغیرہ "

پہلے تو کان کھڑے ہوئے کہ ادہ۔ تو اور یہ مشاعر کیا بلا ہے۔ مگر فوراً سمجھ میں آ گیا کہ مشاعر دراصل اُس شاعر کو کہتے ہیں جس کا شاعر ہونا بھی مشکوک ہو سکتا ہے

اور متشاعر ہونا بھی یقینی نہیں ہوتا مگر چونکہ وہ مشاعروں میں شرکت کرتا ہے لہذا شاعر یا متشاعر ہو یا نہ ہو مگر "مشاعر" ضرور ہوتا ہے گویا یہ شاعروں کی وہ قسم ہے جو صرف مشاعروں میں پڑھنے کے لئے شعر کہتے ہیں۔ جن کا میدانِ عمل اور میدانِ بے عملی جو کچھ بھی ہے مشاعرہ ہے اور جن کا مقصدِ زندگی سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ مشاعرہ خواہ وہ کسی قسم کا ہو۔ کہیں بھی ہو۔ کسی نے بھی کیا ہو اُس میں شرکت کرنا ضروری ہے۔ شاعروں کی یہ قسم مشاعروں کے لئے پیدل قافلوں میں۔ بیل گاڑیوں اور تانگوں میں۔ لاریوں اور موٹروں میں۔ ریل اور ہوائی جہاز تک میں مشاعروں کی شرکت کے لئے رواں دواں نظر آتی ہے۔ موسم کی کوئی قید نہیں، گرمی ہو تو کرتے اور انگرکھے میں جائیں گے۔ جاڑا ہو تو چیسٹر اور کمبل میں جائیں گے۔ برسات ہو تو برساتی اور چھتری میں جائینگے مگر جائیں گے اور ضرور جائیں گے۔ سو کام چھوڑ کر جائیں گے۔ دفتروں سے رخصتِ علالت لے کر جائیں گے۔ شادیوں کی تاریخیں بڑھوا کر جائیں گے۔ کوئی مر جائے تو قبرستان پر مشاعرہ گاہ کو ترجیح دیں گے اور جائیں گے۔ بیمار ہیں تو دوا کی شیشیاں لے کر جائیں گے۔ مختصر یہ کہ مشاعرہ اُن سے نہیں چھوٹ سکتا یوں چاہے زمانے کا زمانہ اُن کو چھوڑ دے۔ یقین نہ آتا ہو تو مئی اور جون کی گرمی میں ملتان میں مشاعرہ کر دیکھئے۔ دسمبر اور جنوری کی سردی میں کوہ مری پر کوئی بزمِ سخن منعقد کر کے امتحان کر لیجئے یا شدید

بارش میں موچی دروازے کی کسی تنگ گلی میں ایک مصرعہ طرح ڈال دیجئے پھر دیکھئے کہ کہاں کہاں کا شاعر پہنچتا ہے اور کس کس حال میں پہنچتا ہے۔ حال خواہ کچھ ہو مگر پہنچے گا ضرور۔ یہ نہیں ہو سکتا مشاعرہ شعرا کے نہ آنے کی وجہ سے ٹل جائے۔

یہ مشاعرہ واقعی مشاعروں کے لئے جیتے اور مشاعروں ہی پہ مرتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے ان کے سر میں مشاعروں کا سودا اور پیر میں مشاعروں کا سنیچر دیکھ لیجئے۔ کوئی بات کسی سے کریں تان ٹوٹے گی آ کر مشاعرے پہ۔ کسی مبحث پر گفتگو کیجئے گھوم پھر کر آئیں گے مشاعروں کے ذکر پہ۔ دُور نہ جائیے غریب خانہ تک زحمت فرمائیے قریب ہی برق صاحب رہتے ہیں۔ آپ بڑے پرانے مشاعر ہیں اور آپ کا دولتکدہ سینکڑوں مشاعر حضرات کا اڈا ہے جہاں مشاعروں کے منتظمین آئے دن آتے رہتے ہیں معاوضے طے ہوتے ہیں سفر خرچ طے ہوتے ہیں/ مشاعروں میں شرکت کے پروگرام بنتے ہیں کہ ایک ہی تاریخ میں اتنے مشاعرے ہیں کون سی ٹولی کس مشاعرے میں جائے کون سی کس مشاعرے پہ دھاوا بولے۔ مختصر یہ کہ عجیب چہل پہل رہتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ برق صاحب کا مکان کیا ہے بھرتی کا دفتر ہے۔ اسی دروازے پر مشاعروں کی لاریاں آ کر ٹھہرتی ہیں یہیں سے مشاعر حضرات دساور کئے جاتے ہیں اور اسی جگہ مشاعروں سے متعلق تمام جھگڑے طے پاتے ہیں اور اگر بدقسمتی سے کبھی

کوئی چہل پہل نہ ہو تو برق صاحب از رہ ہمسایہ نوازی غریب خانہ پہ تشریف لے آتے ہیں اور انکا خیر مقدم کرنا ہی پڑتا ہے۔

" اخاہ قبلہ برق صاحب ہیں۔ تشریف لائیں حضور معلوم ہوتا ہے آج کہیں مشاعرہ وغیرہ نہیں ہے "

برق صاحب نے بڑے استغنا سے فرمایا " حضرت مشاعرہ کیوں نہ ہوتا۔ قصور میں ایک شیخوپورہ میں دو۔ شاہ پورہ میں تین۔ گویا تین مشاعرے تو آج ہی ہیں۔ مگر اب کوئی کہاں تک شرکت کرے میں نے تو اب طے کر لیا ہے کہ ان مشاعروں میں شرکت ہی نہ کرونگا۔ لینا ایک نہ دینا دو سفر میں تکلیف الگ اٹھاؤ۔ رات رات بھر مشاعروں میں جاگو صحت اک ناس ہو کر رہ گیا ہے "

عرض کیا " واقعی آپ کی عمر بھی اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ یہ صعوبتیں برداشت کریں "

کہنے لگے " اجی توبہ کیجئے میں نے تو اب کان پکڑے کہ ہرگز کسی مشاعرہ میں نہ جاؤنگا۔ جتنا سفر خرچ ملتا ہے اُس سے زیادہ صرف ہو جاتا ہے۔ لاکھ سیکنڈ کا کرایہ لو اور انٹر میں سفر کرو مگر حضرت پردیس پھر بھی پردیس ہے طرح طرح کے خرچ نکل ہی آتے ہیں اور ابھی تو آپ کے سر عزیز کی قسم کمال ہی ہو گیا کچھ اس ترتیب سے مشاعرے تھے کہ اب جو گھر سے نکلا ہوں تو پندرہ دن کے بعد گھر لوٹنا نصیب ہوا "

حیرت سے عرض کیا "پندرہ دن کے بعد؟ یعنی مسلسل مشاعرے؟"

کہنے لگے "جی اور کیا دم اُلٹ کر رہ گیا ان مشاعروں سے۔ کہیں ریل سے سفر کیا۔ کہیں لاری سے پہنچے اور ایک جگہ تو اونٹ تانگے پہ سفر کرنا پڑا۔"

ایک نئی بات دریافت کی "اچھا یہ تو فرمائیے کچھ بچ بھی گیا؟"

کہنے لگے "اجی تو یہ کہیے دھیلا بھی نہیں بچا۔ البتہ اب اس کو چاہے بچنا کہیئے یا اس کو مالِ غنیمت سمجھیے کہ سرگودھا کے مشاعرے سے ایک ٹین گھی کا مل گیا تھا۔ کیا کہنا ہے وہاں کے گھی کا۔ عام طور پہ خالص گھی مکھن سے بنایا جاتا ہے مگر اس گھی سے آپ مکھن بنا لیجئے اعلیٰ درجہ کا دانہ دار گھی۔ سیالکوٹ سے ایک ہاکی اسٹک ذرا قیمتی قسم کی مل گئی تھی۔"

تعجب سے پوچھا "ہاکی اسٹک؟ برق صاحب ہاکی اسٹک بھلا آپ کے کس کام کی؟"

برق صاحب نے ہم کو آنکھوں ہی آنکھوں چند گھنٹے ہوئے فرمایا "میرے کس کام کی ہوتی مگر وہاں کی یہی چیز مشہور تھی لہٰذا منتظمِ مشاعرہ سے فرمائش کر دی کہ بندہ زادے نے اسی شرط پر آنے دیا ہے آپکے مشاعرے میں کہ واپسی میں ایک اعلیٰ درجہ کی ہاکی اسٹک لیکر جاؤں۔ چنانچہ مل گئی ہاکی اسٹک ہوگی کوئی پندرہ سولہ روپے کی۔ اور جناب خدا آپ کا بھلا کرے گجرات سے ایک حقہ لایا ہوں۔ حضت کیا حُقہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تاریخی عمارت رکھی ہوئی ہے۔

نہایت عظیم الشان تحفہ دکھاؤں گا آپ کو کسی وقت اور ہاں گجرات ہی سے چارپائی کے پائے بھی لایا ہوں۔ بھئی کیا رنگ ہے اور کیا روغن اتفاق کی بات کہ وزیر آباد کے مشاعرے میں جو پہنچا تو بانی مشاعرہ سے ٹکر آگیا۔ مسہری کا اُن بے چارے نے نوار ایسی لاجواب منگا کر دی ہے کہ میری تو مسہری سج گئی۔"

عرض کیا "برق صاحب۔ اگر اس طرح آپ ہر دورے میں یوں مالِ غنیمت جمع کرتے رہیں گے تو یہ تو گویا آمدنی کی بڑی اچھی صورت ہے۔"

برق صاحب نے بڑی مایوسی سے کہا "اجی کہاں ہر دورے ہیں۔ بڑے بڑے منحوس ہوتے ہیں بانیانِ مشاعرہ ذرا مشکل ہی سے پھنستے ہیں، لائل پور کے مشاعرے میں بڑے ہیر پھیر سے ایک تھان لٹھے کی فرمائش کی تھی میں نے۔ کیا بڑی بات تھی اگر تحفتہً دے دیا جاتا مگر اُن حضرت نے نہایت بے مروتی سے کام لے کر جھٹ اُس کی قیمت بتا دی۔ اب میں کیا کرتا دل چپ رہ گیا البتہ ایک ریشمی تہبند ضرور لایا تھا وہاں سے۔"

عرض کیا "اس کو کہتے ہیں بھاگتے بھوت کی لنگوٹی۔"

ہنس کر بولے "بھئی کیا بات کہی ہے۔ بالکل یہ مثل صادق آئی۔ دیکھئے شارق صاحب اور بزم صاحب تشریف لائے ہیں۔"

اور پھر بلند آواز سے پکارا "ارے بھئی یہاں ادھر ہوں اسی طرف

آجائیے"

شارق صاحب اور بزم صاحب نے نہایت بدحواسی کے ساتھ آتے ہوئے کہا "ملتان کے لوگ تو نہیں آئے تھے آپ کے پاس ؟"

برق صاحب نے سنبھلتے ہوئے کہا "نہیں تو۔ کیوں بات کیا ہے ؟"۔

شارق صاحب نے کہا "چودہ تاریخ کو مشاعرہ ہے ملتان میں دعوت نامے لیکر آئے ہیں احقر صاحب کے یہاں گئے تھے اُن سے وعدہ لے لیا ہے اور سفر خرچ کے علاوہ پچیس روپے طے پائے ہیں"

برق صاحب نے فرمایا "یہاں تو اب تک پہنچے نہیں۔ ایسا تو نہیں ہے کسی نے بہکا دیا ہو۔ بڑے بڑے کم فرما پڑے ہوتے ہیں"

بزم صاحب نے فرمایا "جی نہیں وہ آئیں گے ضرور۔ مجھ سے ملے تھے ــــــــ"

برق صاحب نے بدحواسی سے پوچھا "اچھا۔ یعنی آپ سے مل چکے ہیں؟ میرا نام بھی لیا تھا"

بزم صاحب نے کہا "جی ہاں آپ کا نام میں نے خود ان کی فہرست میں دیکھا تھا اور شارق صاحب کا نام بھی بڑھوا دیا تھا مگر کہتے ہیں کہ میں جا نہیں سکتا"

برق صاحب نے استادانہ شان سے فرمایا "گویا یہ کہتے ہیں کہ یہ جا نہیں سکتے۔

آخر کیوں؟ آخر کیا مجبوری ہے ایسی؟"

شارق صاحب نے کہا "سب کپڑے دھوبی کے یہاں پڑے ہوئے ہیں باہر جانے کے لئے کم سے کم ایک جوڑا تو فالتو ہونا چاہیئے"

برق صاحب نے فرمایا "میاں لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی سمجھا کہ نہ جانے کیا مجبوری ہے۔ عزیز من مشاعرے میں کپڑے نہیں دیکھے جاتے کلام دیکھا جاتا ہے۔ انشاؔ کا واقعہ یاد کرو کہ بھرے مشاعرے میں ایک فقیر تو بڑا لئے ہوئے پہنچا ہے لوگ اس کے بھی روادار نہیں کہ قریب بٹھائیں وہ آگیا ایک طرف بیٹھ جاتا ہے اور اب جو غزل پڑھتا ہے۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

تو سناٹا چھا گیا مشاعرے میں۔ انشاؔ تو اسی بیچ دھج سے غزل پڑھ کا غذ پھاڑ بر جا اور وہ جا مگر مشاعرے کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ تو کہنے کا مطلب یہ کہ جو کپڑے پہنے ہوئے ہو وہ ٹھیک ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ رقم پیشگی مانگو اور ایک جوڑا بنوا لو"

بزمؔ صاحب نے کہا "مصیبت تو یہی ہے کہ پیشگی وہ دے ہی نہیں رہے ہیں"

برقؔ صاحب نے فرمایا "یہ تو غلط ہے صاحب مشاعرے کے لیے شاعر اور

الیکشن کے بعد ووٹر کا ایک سا حال ہوتا ہے۔ پھر کرتے پھریئے ایک ایک کی خوشامد، یاد ہے سیالکوٹ کا مشاعرہ، پچاس پچاس کہہ کر لے گئے اور پندرہ پندرہ ٹکائے۔ تو جناب یہ غلط ہے جو کچھ طے کر لیں وہ گن دیں سید ھے ہاتھ سے"

بزم صاحب نے چونکتے ہوئے کہا "لیجئے وہ آ کر رکا تانگہ وہی لوگ ہیں"

برق صاحب نے گھبرا کر کہا۔ "شارق میاں دوڑ نا ذرا اسی طرف لے آؤ۔ اور بزم بھائی ذرا اچار پان اور آدھی ڈبیہ سگریٹ کی لے لینا قنبولی سے میرا نام لے کر"

شارق صاحب منتظمین مشاعرہ کو لے کر اسی طرف آ گئے۔ برق صاحب نے ان کو سر آنکھوں پہ جگہ دی۔ آدھی ڈبیہ سگریٹ کھول کر ان کے سامنے رکھ دی۔ پاس ہی پانوں کی پڑیا بھی دکھا دی۔ مزاج پرسی ہوئی۔ تشریف آوری اور پھر دادآوری کے شکریئے ادا کئے گئے اور آخر معاملہ کی گفتگو شروع ہو گئی۔ منتظمین مشاعرہ میں سے ایک صاحب نے فرمایا:۔

"قبلہ بات یہ ہے کہ چودہ تاریخ کو قائد اعظم میموریل فنڈ کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کی کل آمدنی جمع کر کے قائد اعظم میموریل فنڈ میں بھیج دی جائے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اخراجات

کم سے کم ہوں - اب یہ فرمائیے کہ آپ لوگ ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ کیا ایثار فرما سکتے ہیں "

برق صاحب نے کھیسیں نکال کر فرمایا "آپ نے تو کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے قائد اعظم میموریل فنڈ کا مشاعرہ ہے تو اب ہم کیا کہہ سکتے ہیں ورنہ لاہور سے باہر جانے کے پچاس سے کم تو میں لیتا ہی نہیں اور یہی مطالبہ شارق صاحب اور بزم صاحب کا ہوتا ہے۔ بہر حال سفر خرچ کے علاوہ آپ چالیس چالیس کر دیجئے "

منتظم مشاعرہ نے کہا "چالیس تو بہت ہیں برق صاحب اس طرح تو ہم کچھ بھی نہ بچا سکیں گے۔ ہم نے آپ تینوں کیلئے بیس بیس روپے طے کئے تھے یہ رقم حقیر ضرور ہے مگر مقصد دیکھئے کس قدر عظیم ہے "

برق صاحب نے فرمایا "حضور والا یہ تو درست ہے، مگر آپ نے بیس سے زیادہ بھی لوگوں کو دیئے ہیں "

منتظم صاحب نے فرمایا "صرف احقر صاحب کو، اور وہ بھی اس لئے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں مشاعرہ کمیٹی کا کھانا نہ کھاؤنگا بلکہ چونکہ پرہیزی کھانا ہوں لہذا اپنا انتظام خود کرونگا "

برق صاحب نے فرمایا "اور سفر خرچ "

منتظم صاحب نے فرمایا "تیرہ کی رات کو لاری میاں پہنچ جائیگی اور آپ لوگ

چودہ کی صبح کو تڑکے تڑکے یہاں سے روانہ ہو جائیں تاکہ آسانی سے پہنچ جائیں۔"

برق صاحب نے فرمایا: "یہ تو منظور ہے مگر اب ایک شرط ہے کہ جو کچھ طے ہوا ہے وہ یہیں عنایت کر دیجیے۔ یہ ہم لوگوں کا اصول ہے اور ہم اس پہ سختی سے پابند ہیں۔"

منتظم صاحب نے کہا: "برق صاحب یہ تو ممکن نہ ہوگا۔ بات یہ ہے کہ پچھلے سال ہم نے پیشگی رقمیں دے دی تھیں نتیجہ یہ ہوا کہ تین سو روپیہ اپنی گرہ سے بھرنا پڑا اور شعرا نے شرکت نہ کی۔ بہر حال آپ کو یہ رقم وہاں پہنچتے ہی مل جائے گی۔"

برق صاحب نے گویا آخری فیصلہ سنا دیا۔ "یہ غلط ہے جناب اگر آپ ہم پر اتنا اعتماد بھی نہیں کر سکتے تو ہم تیار نہیں ہیں۔"

منتظم مشاعرہ نے لاکھ خوشامد کی لاکھ سمجھایا مگر برق صاحب کسی طرح تیار نہ ہوئے آخر بمشکل تمام سمجھوتہ یہ ہوا کہ لاری ڈرائیور کے ہاتھ یہ رقم بھیجی جائے گی پہلے وصول کر لیجیے پھر لاری میں قدم رکھیے۔"

منتظمین مشاعرہ کے جانے کے بعد شارق صاحب نے کہا: "اب بتائیے وقت اتنا کم ہے اور غزل بھی طرح میں کہنا ہے۔ پھر مہی گیر بڑے والا قصہ۔ صاحب مجھ کو تو نہ لے جائیے۔"

برق صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا: "میاں توبہ ہے تم سے بھی۔ بابا تم مجھ

ایک جوڑا اسے لو۔ بس اب تو خوش ہو۔ مصرعہ طرح کیا ہے"

برمؔ صاحب نے کہا:

"مرے ذوقِ نظر کی ایک حد ہے آسماں کیا ہے"

برقؔ صاحب نے کہا "تمہارے پاس غزل تو موجود ہوگی راولپنڈی کے مشاعرے کی"

شارقؔ صاحب نے کہا "وہ تو۔ کہاں کیا تھا۔ آسماں کیا تھا۔ میں ہے"

برقؔ صاحب نے ہنسکر فرمایا "بھئی سخت بیوقوف ہو تھا کو ہے بناتے ہوئے بھی کوئی دیر لگتی ہے پڑھو اپنا مطلع"

شارقؔ صاحب نے مطلع پڑھا:

فنا کے بعد اب جانا کہ پردہ درمیاں کیا تھا
کھلی جب آنکھ تو سمجھا کہ یہ خوابِ گراں کیا تھا

برقؔ صاحب نے کہا: کہیئے اسے یوں

فنا کے بعد جانینگے کہ پردہ درمیاں کیا ہے
کھلے گی آنکھ تو سمجھینگے یہ خوابِ گراں کیا ہے

برقؔ صاحب شارقؔ صاحب کے "تھا" کو "ہے" کرنے میں مصروف تھے اور ہم پر یہ صداقت چھائی جا رہی تھی کہ واقعی یہ قوم نہ تو شاعر ہے نہ اس کو متشاعر ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس کا اگر کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ مُشاعر اور صرف مُشاعر ہے۔

بخیالِ خویش خبطے

اللہ جانے یہ مولوی نور اللہ ہمارے کن گناہوں کا عذاب ہیں؟

ہزار مرتبہ سمجھایا کہ مولانا چاہے جیسی قسم لے لیجئے پاکستان صرف ہم نے نہیں بنایا ہے اور نہ اُس کے آئین کے ذمہ دار ہم ہیں۔ ہمارا قصور اگر ہے تو صرف اتنا کہ پاکستان کا نعرہ بلند کرنے میں ہم ضرور شریک تھے اور پاکستان بن جانے کے بعد جتنی خوشی دوسرے مسلمانوں کو ہوئی ہوگی اگر اُس سے زیادہ ہم کو ہوئی ہو تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔ مگر توبہ کیجئے وہ تو گویا یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ کیا دھرا ہمارا ہے۔ جان کو آگئے ہیں زندگی عذاب کر رکھی ہے اور اب یہ قطعی طے ہے کہ ہم دونوں بیک وقت اس دُنیا میں رہ ہی نہیں سکتے

یا مولوی نور اللہ زندہ رہیں گے یا ہم، خواہ اس سلسلہ میں بُڈھولی خودکشی کی ترغیب دے یا ہمت قتل کی ترکیب سمجھائیے۔"

بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ گھر سے نکلے اور مولانا نے آ دبوچا بحضرت بولنے کہا "السلام علیکم۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے اپنا پاکستان"

اور ہم نے گھوم پھر کر دیکھا تو صرف ایک راہگیر نظر آیا جو نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی بائیسکل پر سوار چلا جا رہا تھا۔ اب ہم حیران کہ یا اللہ اس راہ چلنے والے کی کونسی بات مولانا کو ایسی ناگوار گزری ہے کہ ہم کو پاکستان کے طعنے دیئے جا رہے ہیں۔ ابھی ہم سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ مولانا بالکل قریب آکر بولے۔

"نام رکھا ہے پاکستان۔ دعوٰے یہ تھا کہ صاحب ہم کو ایک ایسا خطۂ زمین چاہیئے جہاں ہم اپنی روایات کو زندہ کر سکیں ہمکو ایک ایسی مملکت چاہیئے جہاں ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں اور دنیا کو اسلامی جہانبانی سے ایک مرتبہ پھر روشناس کرا سکیں اور حال یہ ہے کہ اب تک ڈاکٹر پوجے جا رہے ہیں۔ انگریزی دواؤں کے بغیر گویا زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ جب تک انگریزی میں لکھا ہوا نسخہ نہ ہو اُس وقت تک جیسے موت ٹل ہی نہیں سکتی"

حیرت سے پوچھا، "کیسا ڈاکٹر مولانا۔ کس کی دوا۔ کہاں کے نسخے؟"

اُن ہی تیوروں سے بولے "شیخ صاحب بیمار ہیں نا۔ اسلامی اخلاق ہے کہ عیادت کرنا چاہیئے پڑوسی کی۔ میں بھی چلا گیا دیکھنے تو دیکھتا کیا ہوں کہ میز پر ہی انگریزی دواخانہ سے آیا ہُوا مکسچر رکھا ہُوا ہے اور مُنہ میں وہی حرارت دیکھنے کا انگریزی آلہ لئے پڑے ہیں۔ میاں میں پوچھتا ہوں کیا دُنیا جہاں سے حکیم اُٹھ گئے ہیں۔ کیا یونانی طب دُنیا سے ناپید ہو چکی ہے اور کیا پاکستان بن جانے کے بعد یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ یہاں اب بھی ڈاکٹروں کو عروج حاصل ہو اور حکیموں کو پاکستان میں بھی نہ پوچھا جائے۔ اپنا اسلامی طریقۂ علاج چھوڑ کر ہم آزاد ہونے کے بعد بھی انگریزوں ہی کی غلامی کر رہے ہیں۔"

دبی زبان سے عرض کیا "اچھا گویا آپ نے ہندو پانی اور مسلمان پانی کی طرح طب کے بھی مذہب مقرر کر دیئے ہیں اسلامی طب اور انگریزی طب۔"

آنکھیں نکال کر بولے "میاں ان ہی باتوں سے آگ لگتی ہے تن بدن میں۔ مذہب میں نے مقرر کیئے ہیں یا اصل میں ہے ہی قصہ۔ یہ ڈاکٹری انگریزی نہیں تو کیا اسلامی طریقۂ علاج ہے۔"

بہت ادب سے عرض کیا "اچھا فرض کیجئے ڈاکٹر یہی نسخے اُردو میں لکھنے لگیں تو ــــــ"

لیجئے ان کو ایک نیا مبحث مل گیا "بس اب مُنہ نہ کھلواؤ میرا۔ بڑے دعووں سے پاکستان بنایا تھا معلوم ہوتا تھا کہ کایا ہی پلٹ جائے گی اور دن پھر جائیں گے

مسلمانوں کے بھی نگر میں تو اب تک یہی دیکھ رہا ہوں کہ وہی ایم۔ اے۔ بی۔ اے کی پنخ یہاں بھی لگی ہوئی ہے۔ اُردو کا یہاں بھی وہی حال ہے جو پہلے تھا۔"

اس غلط بیانی کی تردید کیونکر نہ کرتے۔ عرض کیا "مولانا یہ تو آپ کی زیادتی ہے اُردو کو یہاں کی قومی اور سرکاری زبان تسلیم کیا جا چکا ہے اور اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنتا تو اُردو غریب کو پنپنے کیلئے یہ گوشہ بھی نہ ملتا اور وہی حال ہوتا جو آج ہندوستان میں اُردو کا ہے ——"

دانت پیس کر بولے "پھر وہی۔ جان بوجھ کر آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو۔ سرکاری اور قومی زبان تو بنا دیا گیا ہے اُردو کو پھر کیوں دفتری کارروائیاں، انگریزی میں ہوتی ہیں۔ پھر کیوں سرکاری ملازمتوں کیلئے اُردو کی قابلیت نہیں دیکھی جاتی بلکہ انگریزی ڈگریاں دیکھی جاتی ہیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں پہ تو انگریزی کے ساتھ اُردو میں بھی پاکستان لکھ دیا گیا ہے مگر ان ٹکٹوں پہ جو مُہر لگتی ہے وہ کس رسم الخط میں ہوتی ہے۔ ہوائی ڈاک کا لیبل کس زبان میں ہے۔"

عرض کیا "مولانا آپ تو نہایت جزوی باتیں کر رہے ہیں اور لطیفہ یہ ہے کہ خود بھی لیبل کہہ گئے۔"

کچھ ہکلا کر بولے "وہ میں اس لئے کہہ گیا کہ میرے نزدیک تو کوئی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ خدا لگتی کہیئے گا کہ کیا یہ انگریزیت نہیں ہے کہ اعلیحضرت شہنشاہِ ایران تشریف لائے تو ان کو بھی ڈاکٹر آف لا کی اعزازی

ڈگری دی گئی ہے"

عرض کیا "اور نہیں تو کیا آپ کی رائے میں کوئی منشی فاضل وغیرہ کی اعزازی سند پیش کی جاتی"

کہنے لگے "برادر مکرم آپ تو مضحکہ خیزی پہ اُتر آئے مگر یقین جانیئے کہ اگر ایک اسلامی مملکت کی طرف سے ان کی خدمت میں علومِ اسلامی کی دستارِ فضیلت پیش کی جاتی تو ہم بھی کہتے کہ ہاں صاحب یہ بات ہوئی ہے پاکستان کے شایانِ شان۔ مگر بجائے اس کے یہاں بھی وہی ہوا جو انگلستان میں ہو سکتا تھا۔ صاحب ان کی تشریف آوری کے سلسلہ کی کونسی تقریب ایسی تھی جس میں انگریزیت نہ ہو۔ عصرانہ کو گارڈن پارٹی کہا گیا۔ اور انگریزی میں اس کے دعوت نامے چھپ کر تقسیم ہوئے عشائیہ کو ڈنر کہا گیا اور کیوں نہ کہا جاتا جبکہ میز کرسی پہ خالص انگریزی طریقے سے بیروں نے کھانا کھلایا۔ انگریزی لباس میں لوگ شریکِ طعام ہوئے اور اپنی ایک ایک ادا سے اس بات کا یقین دلایا کہ انگریز تو چلا گیا ہے مگر اُس کا بھوت ابھی تک موجود ہے"

مولانا سے بحث کرنا تو بیکار تھا۔ ٹھنڈے دل سے عرض کیا "گویا اعتراض صرف یہ ہے کہ فرشی دسترخوان پہ کھانا کیوں نہ چنا گیا اور اس کو بجائے ڈنر کے ماحضر کیوں نہ کہا گیا"

اور مولانا کو زیادہ خوش کرنے کے لئے عرض کیا "ایک بات تو خود مجھ کو بھی کھٹکی

تھی کہ خود جی بہ بیڈ ہیں آخر سلیوٹ کا اب کیا تک ہے جبکہ ہمارے یہاں السلام علیکم یا آداب عرض اور تسلیمات عرض وغیرہ موجود ہیں۔"

مولانا غالباً اس پہلو کو بھولے ہوئے تھے ایک دم اُبل پڑے "جی ہاں۔ اور صرف سلیوٹ ہی نہیں بلکہ پوری قواعد انگریزی میں ہوئی حالانکہ اگر اپنا خیال تھا تو اردو میں ہوتی یا اگر مہمان کا خیال تھا تو فارسی میں سہی وہ بھی آخر اپنی ہی زبان ہے مگر اردو یا فارسی میں ہوتی تو کیوں ہوتی جبکہ تماشائیوں میں صد فیصدی انگریزی لباس پہننے والے موجود تھے۔ کیوں صاحب کیا یہ ہمارا اور آپ کا بلکہ حکومت کا فرض نہیں ہے کہ اب جبکہ انگریز جا چکا اور ہم آزاد ہیں۔ اپنی آزاد مملکت ہے تو قانوناً اس انگریزی لباس کو ممنوع قرار دیا جائے اور عبرت انگیز سزائیں دی جائیں ان سوٹ پہننے والوں کو اور ٹائی کالر باندھنے والوں کو۔"

عرض کیا "یا کم سے کم یہ کیا جائے کہ صرف کرتہ اور تہبند استعمال کرنیوالوں کو سرکاری وظائف ہی ملنے لگیں تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ حکومت کی خوشنودی اسی لباس سے حاصل کی جا سکتی ہے۔"

بڑی مایوسی سے بولے "اجی توبہ کیجئے وظائف تو درکنار حال تو یہ ہے کہ ایک سوٹ پہننے والا اب بھی جہاں چاہتا ہے وندناتا ہوا چلا جاتا ہے اور اس قسم کا سادہ لباس پہننے والا خواہ وہ کوئی بھی ہو اپنا بھرم مشکل ہی سے قائم کر سکتا ہے

پولیس والا جب ڈوکے گا اِسی مرد ملّاں کو ٹوکے گا"

عرض کیا "ہر چند کہ خود میرے داڑھی نہیں ہے مگر میں اکثر غور کیا کرتا ہوں کہ آخر اہلِ پاکستان سے داڑھی کیوں نہیں رکھوائی جاتی "

مولانا کو ایک بھولی ہوئی بات یاد آگئی ریشِ مبارک پہ ہاتھ پھیر کر بولے۔ "اب دیکھ لیجیئے کہ ہمارا نیا بجٹ آیا ہے ۔ بہت عمدہ بجٹ ہے یعنی میزانیہ معاف کیجیئے گا میں نے بجٹ اس لئے کہا تھا کہ شاید میزانیہ نہ سمجھیں ۔ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ نہایت لاجواب ہے یہ میزانیہ البتہ اگر اس میں داڑھی مونڈھنے والوں پہ ایک ٹیکس ۔ خیر یہ ہی کہنا چاہیئے اس ٹیکس کو بہر حال اگر داڑھی مونڈھنے والوں پہ ایک جزیہ عاید کر دیا جاتا اور یہ داڑھی مونڈھنے کے اُستروں کے نرخ بڑھا دیئے جاتے اور حجاموں پہ پابندیاں عاید کر دی جاتیں تو یقیناً یہ اندازہ ہوتا کہ حکومت کا منشا کیا ہے ۔ جناب والا اگر داڑھی مونڈھنے پہ جزیہ عاید کر دیا جائے اور مونچھیں مونڈھنا خلافِ قانون کر دیا جائے انگریزی وضع کے بال بغیر طبی سند کے کوئی نہ رکھ سکے اور یہ انگریزی سامان آرائش ممنوع قرار پا جائے تو نقشہ ہی نہ بدل جائے پاکستان کا "

عرض کیا "بیشک اگر اہلِ پاکستان کا حُلیہ بدل جائے تو نقشہ بدلنے میں کیا دیر لگتی ہے "

مولانا نے اپنی تائید پا کر اندازِ گل افشانیٔ گفتار کے اور بھی جوہر دکھلائے۔

کہنے لگے "بھئی اگر سچ پوچھئے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ پاکستان وہ سرزمین ہوگی جہاں ہر طرف نور ہی نور ہوگا اس مغربی ظلمات کا کوسوں پتہ نہ ہوگا۔ کس قدر طبیعت خوش ہوتی اگر چودھری ظفر اللہ خاں صاحب لیک سکس میں بھی اُردو ہی میں تقریریں کرتے۔"

عرض کیا "جی اور، کیا دنیا کو غرض ہوتی تو خود ترجمے کراتی پھرتی"

کہنے لگے "بھائی میرے اُردو زبان اُس وقت تک عالمگیر حیثیت حاصل ہی کیونکر کر سکتی ہے جب تک کہ عالمگیر معاملات میں اس کو استعمال نہ کیا جائے۔ صاحب آگ ہی تو لگ جاتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے پاکستان میں بھی جس کو دیکھئے وہ انگریزی ہی اخبار پڑھتا ہے گویا انگریزی اخباروں کی خبریں زیادہ سچی ہوتی ہیں اور اُردو اخبار گویا کسی قابل ہی نہیں ہیں۔ اب ایمان سے کہئے کہ کیا اس کی ضرورت نہ تھی کہ ان انگریزی اخباروں کا ایک سرے سے مقاطعہ کر دیا جاتا کہ جاؤ تمہارے پڑھنے والے تشریف لے گئے۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

مگر میں تو جو زور شور انگریزی اخباروں کا دیکھ رہا ہوں وہ اُردو اخباروں کا کم سے کم مجھ کو نظر نہیں آتا"

مولانا کو ایک اور گوشہ سُجھاتے ہوئے عرض کیا "بات یہ ہے قبلہ کہ خبر رساں ایجنسیاں اب تک انگریزی ہی میں تار بھیجتی ہیں"

مولانا جھلا گئے "یہ وہ پھبتی اس لئے ہیں کہ ان پہ کوئی قانونی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے ذرا سرکاری طور پر ان کو منع کرکے دیکھا جائے طبیعت ٹھکانے آ جائے گی اور آنے لگیں گے اردو میں تار وار سب۔ مگر آپ کے پاکستان والوں کو اس کا خیال ہی کب ہے اور پرواہ ہی کس کو ہے"

اب ہم نے بھی احتجاج کیا "مولانا یہ آپ میرا پاکستان کیوں بنائے ہوئے ہیں حالانکہ خود آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان جس قدر آپ کا ہے اُس سے زیادہ میرا نہیں مگر طعنہ آپ صرف مجھ کو دیتے ہیں"

کہنے لگے "یہ جی طعنہ یوں دیتا ہوں کہ دیکھ رہا ہوں آپ کی وضع قطع آپ کا طرزِ معاشرت اور آپ کے رہنے سہنے کے طور طریقے۔ یہ جو آپ نے اپنی مردانہ نشست کا اسمِ مبارک ڈرائینگ روم رکھ چھوڑا ہے اور اس میں بجائے مسند اور تکیہ کے صوفہ سٹ سجا رکھے ہیں اور دیواروں پر تصاویر آویزاں ہیں عجیب عجیب قسم کی اور یہ جو آپ کا کھانے کا کمرہ ہے جسے آپ ڈائننگ روم کہتے ہیں میز کرسیوں سے آراستہ ہے۔ یہ سب انگریزیت نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ پاکستان کی مناسبت سے اپنے ان کمروں کو بھی اب مشرف باسلام کرتے۔ معلوم تو ہوتا کہ یہ ایک پاکستانی کا گھر ہے۔ صاحب اس قسم کے گھر تو آپ کو انگلستان میں بھی مل جائیں گے ان میں پاکستانی خصوصیت کیا ہے اور یہ جو آپ کوٹ اور پتلون زیب تن کئے ہوئے ہیں کیا یہ آپ کا قومی لباس ہے

اور سے بھئی ہم نے تو کسی انگریز کو کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے آپ کے ملک میں آکر شیروانی پہنی ہو۔ پاجامہ زیب تن کیا ہو اور آپ ہیں کہ اپنے ہی ملک میں بیٹھے دوسروں کے لباس تک اپنا لئے ہیں۔ خیر پہلے تو آپ غلام تھے مگر اب تو آپ آزاد ہیں اب تو آپ کو چاہیئے کہ اپنا قومی لباس اختیار کریں تاکہ جس طرح اب تک آپ نے دوسروں کے سوٹ پہنے ہیں اُسی طرح اب دوسرے آپ کا لباس فخر کے ساتھ استعمال کریں۔"

عرض کیا "مولانا یہ بات آپ نے کچھ واقعی معقول سی کہی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ ابھی تک ہمارا قومی لباس طے نہیں ہوا ہے۔"

مولانا بولے "تو آخر کب طے ہوگا جب یہ سوٹ آپ کی کھال بنکر رہ جائیگا آخر اب تک قومی لباس تک طے کرنے کا ہوش نہیں آیا۔"

عرض کیا "مولانا قصہ دراصل یہ ہے کہ ابھی اہم کاموں کا انبار ختم نہیں ہوا ہے، کہ ان جزویات کی طرف بھی توجہ دی جا سکے۔ ابھی تو اپنے کو منظم اور مستحکم کرنے کے نہایت اہم مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں سب کے سب۔ بہرحال جب تک ہم اور آپ ہی یہ طے کرلیں کہ قومی لباس کیا مناسب رہے گا۔"

کہنے لگے "بس دیکھ لو مجھ کو نہایت شریفانہ لباس پہنے کھڑا ہوں۔"

ہم نے سر سے پیر تک مولانا کا جائزہ لیکر عرض کیا "ممکن ہے کہ یہ شریفانہ لباس ہو مگر ہم کو ان میں سے کچھ چیزیں یا غیر شریف طبقہ کیلئے بھی تو چھوڑنا پڑینگی

آخر وہ بیچارے کیا پہنیں گے"

کہنے لگے:" دیکھئے صاحب یہ رہا صاف نہایت متین چیز بھی ہے اور بھاری بھر کم بھی جتنا چاہیے اس کو خوشنما بنالیجئے پھر یہ کہ خالص اسلامی چیز ہے"

عرض کیا:" دیکھئے قبلہ اختلاف یہیں سے شروع ہو جائے گا اس لئے کہ قومی لباس میں اگر اب تک کوئی چیز طے ہو سکی ہے تو وہ صرف سر کی پوشش ہے اور شاید آپ بھول رہے ہیں کہ جناح ٹوپی کو قومی لباس کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے"

مولانا نے بھی عید کے دن جناح کیپ پہنی تھی جو خود تو ٹوپی کوزی معلوم ہی ہوتی تھی مگر مولانا اس حد تک کھنچی نظر آتے تھے کہ گویا ذرا سر جھکایا اور ناک سے بھاپ نکلتا ہوا چلائے کا پانی نکلنے لگے گا۔ غالباً تو مولانا کو بھی اپنا وہ حلیہ یاد آگیا ہوگا کہنے لگے:" جناح ٹوپی ہے تو ٹھیک مگر صافہ بھی ترک نہ کرنا چاہیئے۔ بہر حال چلئے جناح ٹوپی سہی اس کے بعد لمبا کرتہ۔ کرتے پر جاڑے میں صدری اور گرمیوں میں کچھ نہیں ــــــ"

عرض کیا:" غضب کر رہے ہیں مولانا آپ یہ لباس آپ پہنیں گے تو کانگرسی بنیا کیا کریں گے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ صدری کہتے ہیں وہ نہرو جیکٹ کہتے ہیں لمبا کرتہ ان کا بھی ہوتا ہے"

بات کاٹ کر بولے:" بھئی اس لباس پر جُبہ پہن لیا جائے"

مولانا شاید لباس کی اور بھی تفصیل بتاتے کہ ان کے صاحبزادے نو کرکے سر پہ

کموڈ اٹھوائے ہوئے جاتے نظر آئے تو مولانا نے پکارا۔

"ارے بھئی یہ کہاں لے جا رہے ہو"

جواب ملا "بیڑہ جڑوانے لے جا رہا ہوں صبح ٹوٹ گیا تھا"

اور ہم نے مولانا سے پوچھا "قبلہ۔ یہ کموڈ اور آپکے یہاں"

کہنے لگے "ارے بھئی یہ کوئی میرا تھوڑی ہے جب مکان پر قبضہ کیا ہے تو یہ چیزیں مکان ہی میں سے نکلی تھیں لہذا اب مجبوراً ان کو استعمال کرنا ہی پڑتا ہے اور جب ان چیزوں کو استعمال کرتا ہوں ضمیر بھی ملامت کرتا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی پاکستان ہے۔ مگر میں تو کچھ بھی حال ہر طرف دیکھ رہا ہوں اور دیکھ دیکھ کر جل رہا ہوں"

جنسِ ہُنر بیچتا ہُوں

عین اُس وقت جب بیروزگاری سے تنگ آکر یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ نمائش
میں ایک اسٹال ٹکیہ چاٹ کی دکان کھول لیں اور دہی بڑے بیچکر کسی طرح پیٹ
تو پال لیں، مرزا صاحب نے آکر ملازمت کا مژدہ سنایا۔ سوکھے دھانوں پانی برسا۔
جی چاہا کہ مرزا کے قدموں پہ گر کر مارے شکر گزاری کے جان دے دیں۔ کہاں
ملتے ہیں کسی کو ایسے دوست جو بدبختی میں بھی ساتھ نہ چھوڑیں اور وقت پر
یوں کام آئیں۔ ایک تو ملازمت ڈھونڈھی پھر وہ بھی ایسی کہ ملازمت کیوں
کہیئے ریاست کہیئے اُس کو۔ سو روپیہ ماہوار تنخواہ، کھانا نواب صاحب کے ساتھ اُن ہی کے
دسترخوان پہ۔ رہنے کو مکان۔ سواری میں موٹر۔ خدمت کیلئے نواب صاحب کے

بے شمار خدمتگار موجود اور کام صرف یہ کہ نواب صاحب کے کلام پر اصلاح دیدیا کریں۔ گویا استادِ شہ۔ جس سے غالب کی بھی یہ تاب۔ یہ مجال اور یہ طاقت نہ تھی کہ پرخاش کا خیال کرتے۔ دیر تک تو یہ یقین ہی نہ آیا کہ مرزا جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے اور جب یقین آیا اور انکا شکریہ ادا کرنا چاہا تو وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار نظر آئے :-

" یعنی عجیب منحوس ہو۔ میں نواب صاحب سے کہہ کر آیا ہوں کہ ابھی لا رہا ہوں تم کو اور تم ہو کہ منہ اٹھائے بیٹھے ہو چغد کی طرح۔ کپڑے پہنکر چلو نا میرے ساتھ پھر اُن کے حرم سرا میں جانے کا وقت آجائے گا "

جلدی جلدی کپڑے بدلے اور ہر چند کہ سو پشت سے آبا کا پیشہ کچھ سپہ گری ہی کی قسم کا تھا مگر آج چونکہ شاعری ذریعۂ عزت بن رہی تھی لہذا اپنے کو اپنے نزدیک بڑا استاد السلطان بنا کر مرزا کے ساتھ ہو لئے۔ راستہ بھر مرزا آداب دربار سمجھاتے رہے اور بار بار یہ اصرار کہ ذرا لئے دیئے رہنا اپنے کو گرا پڑا ثابت نہ کرنا۔ کلام کی فرمائش ہو تو ذرا کوئی ٹھاٹھ دار چیز سنانا اور پڑھنے کا انداز ایسا ہو کہ جھوم ہی تو جائیں سب۔ ہم ایک ایک بات گرہ میں باندھے ہوئے آخر نواب صاحب کی کوٹھی کے دروازے پر جا پہنچے یہاں مرزا نے آخری مرتبہ ہم کو سر سے پیر تک دیکھا اور ہر طرح کا اطمینان کرنے کے بعد آخری بات سمجھاتے ہوئے کہا " اگر اتفاق سے خود نواب صاحب بہادر اپنا کلام سنانے بیٹھ

جائیں تو خواہ وہ کتنا ہی مہمل ہو مگر تم داد دینے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دینا" اور اس آخری ہدایت کے بعد وہ ہم کو لیکر کوٹھی میں داخل ہو گئے۔

کوٹھی کے سبزہ زار پر اس وقت دربار لگا ہوا تھا کہ سب لوگ پر حاضرین بیٹھے ہوئے تھے اور صدر میں ایک تخت پر اولوالعزم کی نسل کے ایک بزرگ گاؤ تکیہ کا سہارا لئے اپنے شفاف سر پر خدمتگار سے تیل کی مالش کرا رہے تھے کہ مرزا نے پہنچ کر فرشی سلام کرتے ہوئے کہا "حضور والا دیکھئے آخر میں لے ہی آیا خنجر صاحب کو شاگردوں کا ایک جم غفیر تھا اور اصلاح دینے کا سلسلہ جاری تھا مگر حضور کا نام لیا تو بیچارے سب کچھ چھوڑ کر چلے آئے"

ہم نے بھی فرشی سلام کیا۔ نواب صاحب نے بمشکل تمام اپنا بوجھ خود اٹھا کر ذرا سا ابھرتے ہوئے فرمایا "تشریف رکھیئے۔ آپ کی بڑی تعریف سنی ہے مرزا صاحب سے۔ تو آپ کس قسم کے شعر بناتے ہیں؟"

ایکدم چکر سا آگیا کہ یا اللہ "یہ شعر بنانا" کیا ہوتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ مرزا صاحب ہماری طرف سے بول رہے تھے "حضور ماشاء اللہ آپ کے استاد ہیں یہ ہر قسم کے شعر لاکھوں کی تعداد میں کہہ کہہ کر شاگردوں کو بانٹ چکے ہیں اور خود بھی تین چار تو دیوان اپنے ہی ہیں"

نواب صاحب نے یکمشت چھ سات پان اپنے تنور نما منہ میں ٹھونستے ہوئے

فرمایا۔ "بھئی خود ان کو بھی تو بولنے دو کیا بتایا تھا تم نے لقب آپ کا۔"

مرزا نے کہا۔ "حضور لقب نہیں تخلّص۔"

حاضرین دربار میں سے ایک صاحب بولے۔ "وہ بھی ایک قسم کا لقب ہی ہُوا نا۔"

ہم نے جلدی سے عرض کیا۔ "اس خاکسار کو خنجرؔ کہتے ہیں۔"

نواب صاحب نے اُگالدان میں مُنہ ڈالتے ہوئے فرمایا۔ "خنجر۔ ٹھیک مطلب یہ کہ قتل کرتے ہوں گے آپ اپنی چیزیں سُنا سُنا کہ لوگوں کو۔ اچھا تو پھر ہو جائے کوئی پھڑکتی ہوئی چیز۔ کیوں بھئی دلاور خاں کیا صلاح ہے۔"

دلاور خاں نے کہا۔ "کوئی حقانی چیز ہے استاد۔"

نواب صاحب نے کہا۔ "اماں تم تو ہو نرے گھامڑ۔ حقّانی چیز کا بھلا کونسا موقع ہے نہ جمعہ نہ جمعرات۔ استاد آپ تو کوئی عاشقانہ چیز سنائیے کہ طبیعت لوٹ پوٹ ہو کر رہ جائے۔"

ایک اور صاحب بولے۔ "ہاں یہ بات کہی ہے سرکار نے۔ تو پھر استاد شروع ہو جائیے۔"

ہم ابھی لیس و پیش ہی کر رہے تھے کہ مرزا نے تھرا تو رنگا ہوں سے گھور اور دانت پیس کر اشارہ کیا کہ سناؤ اور یہاں یہ عالم کہ کوئی ایسی چیز سمجھ میں نہ آرہی تھی جو اس محفل میں سُنائی جا سکے آخر مرزا نے خود ہی کہا۔ "خنجر صاحب

اپنی وہ غزل سنائیے جس پہ مشاعرے میں آپ کو تمغہ ملا تھا۔ وہ کیا ہے غزل گریباں نہ ہوا۔ بیاباں نہ ہوا"

تمغہ ومغہ تو خدا نہ کرے کہ ملتا البتہ غزل اس زمین میں ضرور تھی جان پہ کھیل کر یہی غزل شروع کر دی۔ اب یہ عالم کہ ہم غزل پڑھ رہے ہیں اور ہر شعر پہ نواب صاحب "ہے ہے ہے" کر کے نہایت بدتمیزی سے ہنس رہے ہیں یا کبھی کبھی گھٹنے پہ طبلہ بجانے لگتے ہیں خدا خدا کر کے بمشکل تمام غزل ختم ہوئی۔ نواب صاحب نے داد دیتے ہوئے فرمایا "یار مزا آ گیا۔ کیا مزے کی چیز سنائی ہے۔ اچھا تو اس پہ تمغہ ملا تھا۔؟"

مرزا نے کہا "ایک تمغہ کیا۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ جس مشاعرے میں پہنچ گئے بس اپنے سامنے کسی کا چراغ جلنے نہیں دیتے"

وہ صاحب جن کا نام دلاور خاں تھا جھوم کر بولے "اور آواز بھی اپنی قسم بڑی پاٹ دار ہے"

نواب صاحب نے کہا "تو بھئی مرزا صاحب تم وہ بات کر لو نا ان سے۔ بس ذرا یہ سمجھا دینا کہ اپنا ہی گھر سمجھ کر رہیں۔ ایمانداری اصل چیز ہے۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ اس ڈیوڑھی پہ جو ایک مرتبہ ملازم ہو گیا پھر مر کر ہی نکلتا ہے"

مرزا صاحب نے کہا "ویسے تو میں بات کر چکا ہوں مگر ان کو ایسا کچھ پھر فیصلہ

کئے لیتا ہوں۔"

نواب صاحب نے کہا "ہاں ساری بات صاف ہو جائے اور ہاں یہ طے کو لینا کہ پھر کسی اور کو یہ شاگردی میں نہیں لے سکتے "

مرزا صاحب نے ہم کو اُٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں ابھی سب کچھ سمجھائے دیتا ہوں"

ہم دونوں اُٹھ کر جب کوٹھی کے ایک علیحدہ کمرے میں پہنچ گئے تو ہم نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "بھئی مرزا صاحب مجھ کو تو سخت وحشت ہو رہی ہے یہاں کس طرح ہیں نباہ کر سکوں گا ان لوگوں سے "

مرزا صاحب نے کھا جانے کے انداز سے کہا "کیا مطلب۔ کونسی بات ایسی ہوئی جس سے وحشت ہوئی آپ کو "

ہم نے حیرت سے کہا "بھئی کمال کرتے ہیں آپ جہاں تخلّص کو لقب کہا جائے۔ جہاں شعر کہنے کو شعر بنانا کہا جائے۔ جہاں ایک شاعر سے حقانی اور عاشقانہ چیزیں سُننے کی فرمائش ہو جہاں بد تمیزی سے ہنس ہنس کر شعر سُنے جائیں اور سُن سُن کر گھٹنے پر طبلہ بجایا جائے اور جہاں بجائے کلام کے آواز کے پاٹ دار ہونے کی داد دی جائے وہاں آپ کے نزدیک وحشت بھی نہ ہو کسی کو "

مرزا صاحب نے بگڑ کر کہا "بس تو پھر جانے دو۔ بڑے شاعر بنے پھرتے

ہیں وہی مثل کہ گھر میں نہیں دانے اور اماں چلیں بھنانے ۔ وہ روٹیوں کا سہارا جو نظر آیا تو دماغ میں لگا کیڑا ادبیگنے ۔ تم تو اسی قابل ہو کہ جوتیاں گھسیٹتے پھرو ۔ مگر کان کھول کر سن لو کہ اب مجھ سے کبھی اپنی بے روزگاری کا رونا رونے نہ بیٹھنا ۔"

ہم نے خوشامد سے مرزا کو مناتے ہوئے کہا "بھئی خفا نہ ہو ۔ تم کو کیا معلوم کہ تمہاری اس ہمدردی کا میرے دل پر کتنا اثر ہے ۔ مگر میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آخر ان نواب صاحب کے کہیں آس پاس بھی شاعری ہے یا میں اصلاح ہی دوں گا ۔ جو شخص تخلص اور لقب تک کی تمیز نہ رکھتا ہو وہ کیوں کر شاعر بن سکتا ہے ۔ جس کو شعر سننا نہ آتا ہو وہ شعر کہہ کیونکر سکے گا ۔"

مرزا نے ڈانٹا "پھر وہی ۔ میں پوچھتا ہوں تم کو آم کھانے سے مطلب ہے یا تم پیڑ گننے آئے ہو ۔ تمہاری بلا سے وہ شاعر بنیں یا نہ بنیں ۔ کمال تو تمہارا یہی ہے کہ تم ان کو اسی مغالطہ میں رکھو کہ وہ شاعر بن گئے ہیں ۔ بھائی تم نوکری کرنے آئے ہو کچھ نہ کچھ تو قیمت دینا ہی پڑتی ہے آخر ۔ اب اگر اس نازک مزاجی سے کام لو گے تو کب چکے تم نوکری میں تو یہ کہتا ہوں کہ عیش کرو گے عیش یہاں ۔ اور اگر ذرا عقلمندی سے کام لیا تو یہ سب بیوقوف تمہاری مٹھی میں بیا رہیں گے ۔"

طبیعت کسی طرح گوارا نہ کرتی تھی مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ روزگار کی اور کوئی

صورت بھی نہ تھی۔ ایک طرف اگر یہ محبت نا جنس تھی تو دوسری طرف بے فیض ہم جنس جیسا کہ ہے ہر ایک خط دو ذائقہ مست۔ آخر ہم نے مرزا سے کہہ دیا کہ "اچھا بھئی مقصد آ رہا ہی گے یہاں بھی جاؤ کہہ دو نواب صاحب سے کہ ہم راضی ہیں۔"

مرزا نے پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا: "یہ تیس روپئیں نہایت احمقانہ تھا۔ ظاہر ہے کہ بیوقوف تو ہوتے ہی ہیں یہ لوگ اور خوش نصیب ہے وہ جس کو بنے بنائے چُغد مل جائیں۔ تم کو تو چاہیئے کہ نواب کو ایسا اپنے شیشہ میں اُتارو کہ پانچوں اُنگلیاں گھی میں ہوں۔ آہ بس یہ ٹھیک ہے اور میں نے بھی کچھ سمجھ کر ہی یہ صورت پیدا کی ہے۔"

مرزا صاحب نے اُسی وقت نواب صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ تمام معاملات طے پا گئے اور خنجر صاحب اسی وقت سے اب آپ کے یہاں رہیں گے۔ یہ سنتے ہی نواب صاحب نے خدمتگار کو مٹھائی اور پھول پان لانے کا حکم دیا تاکہ شاگردی اُستادی کی رسم ادا ہو جائے اور ہم سے کہا:-

"اُستاد اب کوئی اچھا سا۔ وہی کیا نام اُس کا تلفّظ۔"

مرزا صاحب نے بات کاٹ کر کہا: "آپ کا مطلب ہے تخلّص۔ خنجر صاحب ابھی کہہ رہے تھے کہ نواب صاحب کے لئے تخلّص کوثر اچھا رہے گا۔"

نواب صاحب نے چونک کر کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے ہماری بیگم کی چھوٹی

بہن کا یہی نام ہے ۔

ہم نے کہا "دیوانِ حافظ سے تخلص نکالا جائے آپ کے لئے "۔

نواب صاحب نے تعجب سے پوچھا "کون سے دیوانے حافظ؟ حافظ عبدالغفور تو نہیں ۔ وہ تو آجکل باہر ہیں"۔

مرزا صاحب نے کہا "کیوں خنجر صاحب ساقی کیسا رہے گا "۔

نواب صاحب نے اُچھل کر کہا "بھئی یہ ٹھیک ہے ۔ کیوں استاد یہ بڑا بانکا تخلص ہے ساقی "۔

ہم نے عرض کیا "بالکل ٹھیک نہایت اچھا تخلص ہے اور بڑا مبارک ہے "۔

نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا "تو اب ہمارا پورا نام ہوا نواب عبدالکریم خاں ساقی ۔ مزا آگیا یار "۔

اس عرصہ میں ملازم مٹھائی اور پھولوں کے ہار لیکر آگیا ۔ نواب صاحب نے اپنے ہاتھ سے ہمارے گلے میں ہار ڈالا اور ہم نے اپنے ہاتھ سے نواب صاحب کو مٹھائی اور قند دیتے ہوئے کہا "خدا آپ کو شیریں کلام بنائے "۔

حاضرین نے "آمین" کا نعرہ کورس میں بلند کیا اور سب نے نواب صاحب کو مبارک باد دی ۔ نواب صاحب نے اسی وقت اکاون روپے اور ایک قلمدان ہم کو مرحمت فرماتے ہوئے کہا "لو اُستاد یہ اُستادی کا قلمدان اب ہم شاگرد اور تم

اُستاد- اب سے لگے ہاتھ ایک مشاعرہ تو کر ڈالو جلدی سے جیسا نواب ٹکاری کے یہاں ہوا کرتا ہے "

اب سمجھ میں آئی اس شاعری کے شوق کی وجہ کہ یہ سب کچھ نواب صاحب ٹکاری کی چوٹ پر ہو رہا ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا صاحب ذوق رئیس دن رات اس کے یہاں بھی علمی ادبی چرچے- اچھا خاصہ شعر وہ خود کہتا ہے آپ چلے ہیں اُس کی نقل اُتارنے۔ مگر اب تو کرنا ہی تھا مشاعرہ- اخراجات کی منظوری بھی جو نہایت دریادلی سے دی گئی- طرح مقرر کی- دعوت نامے چھپوائے شعرائے کرام سے وعدے لئے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے نواب صاحب کے لئے بھرپور غزل کہی- مگر خدا جانتا ہے کہ غزل کہنے میں اتنی محنت نہیں پڑی جتنی محنت نواب صاحب کو پڑھنے کی مشق کرانے میں کی- ضد یہ تھی کہ گا کر پڑھونگا اُدھر عالم یہ کہ ایسے بے سُرے سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا بمشکل تمام ایک ہفتہ تک شب و روز محنت کر کے موزونیت- تلفظ ادائے کی طرف سے تو تھوڑا بہت اطمینان ہو گیا مگر آواز تو ظاہر ہے کہ جیسی تھی ویسی ہی رہی- اس ایک ہفتہ میں معلوم یہ ہوتا تھا کہ اچھے خاصے بینڈ ماسٹر ہو کر رہ گئے ہیں نواب صاحب غزل پڑھ رہے ہیں اور ہم ان کے سامنے کھڑے ہوئے ہاتھ سے اتار چڑھاؤ سمجھا رہے ہیں خدا خدا کر کے مشاعرے کی رات آئی- نواب صاحب کی کوٹھی پر جشن کا سماں تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب دولہا بنے بیٹھے ہیں-

شہر کے تمام اعلیٰ حکام - رؤسا - اور شعراء میں سے تمام نامی گرامی شاعر محفل میں موجود - یعنی مشاعرہ شروع ہو گیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ اُس وقت تک جاری رہا جب تک شمعِ محفل نواب صاحب کے سامنے نہیں آئی - اب جو ہمارے خداوندِ نعمت کی باری آئی تو ایک تو جناب کی قطع اُس پر سے گھبراہٹ پھر مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ طرز بھول گئے جو صاحب پہلے پڑھ رہے تھے اُن ہی کی دُھن میں شروع ہو گئے اور وہ بھیانک آواز نکالی ہے کہ لاکھ ضبط سے کام لیا پھر بھی لوگوں کی ہنسی نہ رُکی - بمشکل تمام اس طوفان کو رکوایا تو کسی بدتمیز سخن فہم نے داد دیتے ہوئے کہہ دیا کہ "کیا کہتا ہے خنجر صاحب رنگ چھپائے نہیں چُھپتا" - لاکھ عقل کے نیلام کنندہ سہی مگر یہ چوٹ سمجھ گئے اور تیور بگڑ گئے - سونے پہ سُہاگہ یہ ہُوا کہ بحیثیت اُستاد کے آخر میں جو غزل ہم نے پڑھی تو وہ اتفاق سے خوب چلی چھتیں اُڑ گئیں - دھویں بار ہو گئے - نتیجہ اس کا یہ ہُوا کہ مشاعرہ تو خیر ختم ہو گیا مگر شامت آئی ہماری - فوراً طلبی ہوئی اور اب جو دیکھتے ہیں تو نواب صاحب پھُولے سُوجے بیٹھے ہیں - ہم کو دیکھتے ہی برس پڑے -

"کیوں صاحب یہی ہے آپ کی وفاداری کہ آپ نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا - آپ کا قصور نہیں یہ خطا ہے میرے نمک کی میرا مذاق اُڑوایا - لوگوں سے کہتے پھرے کہ میں نے غزل لکھ کر دی ہے"

عرض کیا "توبہ توبہ۔ بھلا یہ کیونکر ممکن تھا مجھ سے۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟"

نواب صاحب نے آنکھیں نکال کر کہا "کہتا کون۔ میں نے خود سنا کہ لوگ آپ سے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ رنگ چھپائے نہیں چھپتا۔ اس کا کیا مطلب تھا آخر؟ پھر یہ کہ اپنی غزل ایسی نکھری بنائی اور میری ایسی پھسپھسی"

عرض کیا "یہ بھی حضور والا کا خیال ہے کسی سخن فہم کے سامنے دونوں غزلیں رکھ دیجئے کہ کونسی غزل اچھی ہے۔ میں نے تو خود غزل کے اچھے اچھے شعر آپ کے لئے نکال دیئے تھے اور کمزور شعر اپنے لئے رکھ لئے تھے"

نواب صاحب نے کہا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یہی بات ہوتی تو آپ کی غزل کیوں اُچھلتی اس قدر۔ اور میری غزل کا کیوں مذاق اُڑتا آخر؟"

اب یہ بات نواب صاحب کو کیونکر سمجھائی جا سکتی تھی کہ مذاق غزل کا نہیں بلکہ خود آپ کا اُڑا ہے۔ آخر عاجز آ کر عرض کیا "بہر حال آئندہ سے میں خود مشاعرہ میں غزل نہ پڑھوں گا"

غالباً نواب صاحب یہی چاہتے تھے سمجھاتے ہوئے بولے "اب دیکھئے نا آپ کو تنخواہ اسی بات کی تو ملتی ہے کہ ہم نے آپ کی شاعری کو گویا خرید لیا ہے۔ آپ نے کسی زردوزی کا کام کرنے والے کو یہ نہ دیکھا ہوگا کہ وہ خود زردوزی کا لباس پہنے۔ آپ نے کسی دھوبی کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے کپڑوں پہ استری کر کے پہنے اور گاہکوں کے کپڑے پہنے رہے۔ آپ نے کسی بڑھئی کو نہ دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے لئے میز کرسیاں بنائے

یہ سب کچھ وہ بناتے ضرور ہیں مگر بیچنے کے لئے ۔ اسی طرح کے آپ بھی کاریگر ہیں۔ آپ بھی شعر بنایئے مگر اپنے لئے نہیں ۔ اب خود اپنا شاعر ہونا بھول جایئے۔"

دلاور خاں نے ہاں میں ہاں ملائی ۔" اور نہیں تو کیا ۔ میاں تم اپنے بال بچوں کا خیال کرو ۔ یہ تو سب امیروں رئیسوں کے شوق ہیں ۔ شاعر بنو گے تو کھاؤ گے کیا ۔"

اور سب نے بھی قائل کیا اور آخر ہم خاموش ہو گئے ۔ نتیجہ یہ کہ اب ہم کو شعر گوئی کی قطعاً اجازت نہیں جو کچھ کہیں وہ سب نواب صاحب کا ۔ خود نہ کسی مشاعرے میں شرکت کی اجازت نہ کسی رسالے میں کلام بھیجنے کا اختیار ۔ البتہ کہتے رہتے ہیں دن رات اور خدا کے فضل سے نواب صاحب کا تیسرا دیوان آجکل پریس میں ہے اس دیوان کے ہر مصرعے کے اعداد نکالنے سے ہماری تاریخ وفات نکلتی ہے ویسے خدا نے ہمیں واقعی جنت نصیب کر رکھی ہے ۔

کافی

چونکہ میرا تعلق ریڈیو سے ہے لہذا غلط فہمی پیدا ہونے کا قوی امکان ہے کہ شاید میں نے ملتانی کافی کے متعلق کوئی نہایت فنی اور تحقیقاتی مقالہ لکھ مارا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد اس وقت گانا نہیں بلکہ محض رونا ہے۔ میں اپنا دردِ دل بیان کرنا چاہتا ہوں اور اگر ہمدردی دنیا سے واقعی مفقود نہیں ہو گئی ہے تو مجھ کو امید ہے کہ میرے ساتھ میری اس بپتا کو پڑھنے والے بھی روئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

صاحب اس خونچکاں داستان کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ مجھ کو حقّہ پینے کے شوق کے سلسلے میں حقّے کا پانی بھی پینا پڑا تھا۔ بہت کم صاحبان

ذوق ایسے ہوں گے جن کو حقّہ کا پانی پینے کا اتفاق ہوا ہو۔ مگر مجھ پر یہ اتفاق یوں گذرا کہ ایک مرادآبادی دوست نے جگر مرادآبادی نے نہیں بلکہ ایک اور کرم فرما نے مجھ کو ایک نہایت لاجواب حقّہ لا کر دیا۔ اس تحفہ سے قبل مجھ کو حقّہ سونگھنے کا تو اتفاق ہوا تھا مگر حقّہ پینے کی نوبت کبھی نہ آئی تھی مگر اس تحفہ نے تو گویا ثابت یہ کیا کہ حقّہ نوشی کا جذبہ ہمارے اندر خدا جانے کب سے ظہور میں آنے کے لئے بیقرار تھا جس کو گویا اس تحفہ کے سلسلہ میں ایک بہانہ مل گیا۔ اسی وقت بڑے ارمان کے ساتھ نہایت پُرتکلف نیچہ بنوایا گیا۔ بہتر سے بہتر چلم خریدی گئی۔ قیمتی سے قیمتی خمیرہ دستیاب کیا۔ حقّہ نوش احباب سے کما حقّہ معلومات حاصل کرنے کے بعد نیچہ کو عطر میں بسایا۔ چلم کے لئے اعلیٰ درجہ کا سرپوش خریدا۔ چاندی کی مہنال بنوائی۔ نازک سا دست پناہ بنوایا۔ مختصر یہ کہ حقّہ کا حق ادا کر دیا۔ اور دوڑ دوڑ کر اس سلسلہ کا ہر کام خود کیا۔ اس لئے کہ سعدی کا یہ مقولہ ذہن میں محفوظ تھا کہ ؎

حقّہ کہ باعقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیٔ ہمسایہ در بہشت

اور اس دن جب کہ اس حقّہ کی رسمِ افتتاح ہونے والی تھی دو چار حقّہ نوش دوست بھی تھے موجود تھے اور اب جو چلا ہے وہ دھواں دھار حقّہ اور جھکی ہے

خمیرے کی خوشبو تو طبیعت باغ باغ ہو گئی مگر یوں سے حقہ پینا سیکھا تاکہ ایسے
مستند حقہ کہے کہ اس فن میں اناڑی نہ معلوم ہوں۔ شام تک دونوں چلمیں بھی نے
اوپر بھری گئیں اور دور چلتا رہا۔

مگر دوسرے دن ہم تنہا تھے۔ حقہ تازہ کیا پانی بدلا۔ چلم بھری اور باقاعدہ
اعتبار سے کر کا دیکھنے لگا کہ اب جو ریسا نہ انداز سے حقہ کا کش لیتے ہیں تو مُنہ
کے اندر حقہ ہی حقہ۔ یعنی حقہ کا تمام پانی گویا کھینچ کر مُنہ میں اور مُنہ سے تھوڑا بہت
حلق کے نیچے بھی گئی۔ منہ صاف کیا۔ اور بمشکل تمام یہ بات سمجھ میں آسکی کہ پانی
زیادہ تھا تب اس کا توازن تو پھونک پھانک کر درست کر لیا۔ مگر وہ جو پانی
پیٹے منہ میں بھر گیا تھا اس کا مزہ آج تک نہیں بھولے ہیں۔

اس واقعہ کو عرصہ ہو چکا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد پھر کبھی
حقہ کا پانی پینے کی نوبت نہیں آئی۔ مگر اس کا مزہ اس قدر تازہ ہے کہ گویا
آج ہی کی بات ہو۔ وہ نامعقول مزہ ایک مرتبہ پھر کچھ اس طرح چکھنا پڑا کہ ایک
خالص صاحب بہادر دوست کے یہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا کیا کہنا
ہے کھانے کا وہ کھانا جس میں پنیر تک موجود ہو جیسا کچھ بھی ہو سکتا ہے اس کو
کچھ اہلِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ پھر پنیر تک بھی وہ کہ انسان معدے کی وسعت
پر رو رہا ہو اور دستر خوان سے اُٹھے۔ مختصر یہ کہ بڑا ہی لذیذ کھانا کھلایا ہمارے
اس دوست نے۔ کھانے کے بعد ذرا پنیر کا دم ہی تو غرض اب بلوا بھیجے

کڑاکے بھنتے رہے۔ خوش گپیاں اور میوے سے شغل جاری تھا کہ بیرا ایک ٹرے میں خوبصورت چھوٹی چھوٹی پیالیاں لئے ہوئے داخل ہوا اور حاضرین نے اپنی اپنی پیالی خود بنالی۔ ہم نے بھی کہا کہ چلو یہ بھی سہی ایک پیالی ہم نے بھی تیار کرلی۔ مگر اب جو اس کا گھونٹ لیتے ہیں تو ———— وہی حقے کا پانی۔ کم بخت سانپ کے مُنہ کی چھچھوندر بن کر رہ گیا وہ گھونٹ نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے بمشکل تمام دوا کے طور پہ اس گھونٹ کو نگلا اور گھبرا کے اپنے دوست سے پوچھا۔

"بھئی یہ کیا چیز ہے؟"

ان حضرت نے ہم کو عجیب چیز سمجھتے ہوئے کہا:-

"کیوں کیا ہوا۔ کافی ہے؟"

اور ہم نے دیکھا کہ سب ہی حاضرین بڑے مزے سے بیٹھے یہ حقہ کا پانی پی رہے ہیں۔ دو تین مرتبہ ہمت کر کے پھر ایک گھونٹ لیا۔ اور اب کی بالکل تصدیق ہوگئی کہ واقعی حقے کا پانی ہی ہے طبیعت اندر سے اُبلنے لگی۔ مگر بُرا ہو تہذیب مجلس کا کہ اگر احتجاج کرتے ہیں تو سخت قسم کے گاودی سمجھے جائیں گے چھوڑتے ہیں اس کو تو ممکن ہے کہ بیرا ہی جانور سمجھ بیٹھے۔ ایک مرتبہ ہمت کر کے آنکھیں بند کیں۔ سانس کو روکا اور غٹ غٹ پی پوری پیالی مُنہ کے اندر۔

جان تو چھوٹی اس نامعقول کافی سے - اور جلدی سے پان کھا کہ طبیعت کو اس طرف سے ہٹانے لگے اس محفل سے آدھی رات کے بعد گھر آنا ہوا - اور اب جو بستر پہ جاتے ہیں تو نیند کا کوسوں پتہ نہیں آنکھیں بند کر کے لیٹے - طرح طرح کے تصور باندھے - کروٹیں بدلیں - کمبل زیادہ معلوم ہوئے تو ایک کو اتار دیا پیر تھوڑے سے کمبل کے باہر نکال لئے مگر نیند ایسی غائب کہ گویا ہم سونے کے عادی ہی نہیں ہیں - اُٹھ کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا - پھر لیٹے پھر کروٹیں بدلیں - اپنے کو خود طرح طرح کی لوریاں سنائیں - مگر جب گھڑی صبح کے پانچ بجا رہی تھی ہم سونے کی درخشوں میں مصروف تھے -

دوسرے دن لوگوں سے ذکر کیا تو پتہ چلا کہ کافی کی خشکی ہم کو راس نہیں آئی - اور کان پکڑ کر توبہ کی کہ آئندہ اس نامعقول چیز کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے - جس محفل میں کافی اس میں ہم ناکافی - کوئی لاکھ تواضع کرے یہاں صاف انکار - مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا رواج واقعی ایسا کافی ہو چکا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے بچکر کوئی کہاں تک رہے - بڑے بڑے سوشل اجتماع کہاں ہوتے ہیں کافی ہاؤس میں - احباب جو کہیں نہ مل سکیں اگر ملیں گے تو کافی ہاؤس میں - ایک ترقی پسند دوست تو کافی ہاؤس کو ایسا اپنا اڈہ بنائے ہوئے ہیں کہ یا تو ان سے تعلقات ختم کئے جائیں ورنہ حقیقے کا پانی پی کر رات رات بھر تڑپا جائے - معلوم ہوا ہے کہ صرف وہی نہیں بلکہ تمام ترقی پسند ادیب

کافی ہاؤس ہی میں پائے جاتے ہیں۔ اور کافی کو ترقی پسند ادب میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے بلکہ غالباً اب امتیاز کی صورت یہی ہے کہ ہر وہ ادیب جو کافی پیئے ترقی پسند ہے اور ہر وہ ادیب جو چائے پیئے رجعت پسند ہے۔ رہ گئے وہ ادیب جو کافی اور چائے دونوں کی جگہ لسی پیتے ہیں ان کے متعلق آئندہ ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں یہ طے ہونے والا ہے کہ ان کو صرف پہلوان سمجھا جائے۔ وہ ادب برائے ادب کے اہل ہی نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف ادب برائے ورزش کی امید ہو سکتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے کسی ادبی نظریہ کا کبھی قائل نہ ہو تو وہ اس کو اٹھا کر پٹخ بھی سکیں۔

سوال تو یہاں اپنا ہے کہ ہم کیا کریں ادب تو در کنار اگر کافی کو انسانیت کی بھی کوئی لازمی شرط قرار دے دیا جائے تو شاید ہم اس کو گوارا کر لیں گے کہ ہمارا شمار آج سے وحوش و طیور میں کیا جائے، چرندوں اور پرندوں میں ہم کو شامل سمجھا جائے مگر ہم کافی نہیں پی سکتے۔ ادیب سمجھے جانے کے لئے اگر کافی کی شرط ضروری ہے تو ہم کو اس پر ہرگز اصرار نہیں کہ ہم کو کوئی ادیب سمجھے مگر سوسائٹی کا کیا علاج کہ ہر ڈنر کا اختتام اسی نامراد کافی پر ہوتا ہے۔ اب تو ہم نے صاف انکار کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ ایک آدھ ڈنر سے تو کھانے کے بعد اس طرح سر پر پیر رکھ کر بھاگے ہیں کہ گویا بیرا کافی کی پیالی لئے

ہوئے دوڑا آرہا ہے پیچھے۔ پارٹیوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کیک کا ایک آدھ پیس کھا کر یا ایک آدھ سینڈوچ زہر مار کر سکے چلے آئے اور گھر آکر پانی پی لیا مگر احتجاج تو اس پر ہے کہ آخر کافی کے بغیر یہ دنیا کیا اب تک اپنے محور پہ گھوم نہیں رہی تھی جو اب بغیر کافی کے چین ہی نہیں آتا۔ ایک دوست سے بحث کی تو وہ کہنے لگے کہ مجھ کو خود شروع شروع میں کافی سے سخت اختلاف تھا۔ ولایت میں کافی مجھ پہ بار گذری ایک آدھ مرتبہ مگر رفتہ رفتہ کافی کا ذائقہ میری زبان پہ کھلا اور جب طبیعت نے اس کو قبول کر لیا۔ تو چائے سے مجھ کو کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ عرض کیا کہ بندہ نواز آخر کافی کے لئے اس جہاد کی ضرورت ہی کیا ہے اس طرح تو انسان شاید سنکھیا بھی اپنے اوپر جبر کر کے کھانے لگے۔ کہنے لگے جی نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ کافی ہے ہی عہدِ حاضر کی سب سے بڑی نعمت اگر آپ کی زبان کو لگ گئی تو۔ ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اب کون ان حضرات کو سمجھائے کہ اگر یہی حال ہے تو امتناع کافی کی مہم بھی کسی خوش مذاق حکومت کو شروع کرنا پڑے گی۔ اور کافی کا پرمٹ صرف ترقی پسند ادیبوں کو مل سکے گا۔ جی تو چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر حقہ کے پانی میں چینی اور دودھ بلکہ کریم وغیرہ ملا کر ذرا چکھیں تو سہی کہ کافی کا مزہ حقہ کے پانی کا ہوتا ہے یا

حقّے کا پانی بھی کافی کا لطف دے سکتا ہے اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جائے تو اچھا خاصا کافی ہاؤس ہم خود کھول سکتے ہیں اور یہ کافی واقعی جن زبانوں پر چڑھ گئی ان کو تو کبھی اصل کافی بھی پسند نہ آئے گی ۔

میں ایک شاعر ہوں

صاحب میں ایک شاعر ہوں۔ چھپا ہوا دیوان تو خیر کوئی نہیں ہے۔ مگر کلام خدا کے فضل سے اتنا موجود ہے کہ اگر میں مرتب کرنے بیٹھوں تو ایک چھوڑ چار پانچ دیوان تو مرتب کر ہی سکتا ہوں۔ اپنی شاعری کے متعلق اب میں خود کیا عرض کروں البتہ مشاعروں میں جانے والے حضرات اگر کسی مشاعرے میں میرا کلام سن چکے ہیں تو وہ بتائیں گے کہ میرے متعلق عام رائے کیا ہے۔ البتہ اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ جب مشاعرے میں میرے نام کا اعلان ہوتا ہے۔ سامعین بے قابو ہو کر اس وقت تک تالیاں بجاتے ہیں جب تک کہ میں پڑھنے کے لئے اسٹیج پر آ نہ جاؤں۔ اور جب تک میں پڑھتا رہتا ہوں داد کے شور سے مشاعرہ

گو کہتا ہی رہتا ہے۔ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے۔ کہ ایک مرتبہ میرا ایک شعر آٹھ مرتبہ مجھ سے پڑھوایا گیا تھا۔ اور پھر بھی سامعین نے یہی کہا تھا۔ کہ سیری نہیں ہوئی۔ یہ سب کچھ میں خود ستائی کے طور پر عرض نہیں کر رہا ہوں۔ میرا قول تو یہ ہے کہ۔ من آنم کہ من دانم۔ میں تو یہ سب کچھ اس لئے عرض کر رہا ہوں۔ کہ اپنے متعلق تھوڑا بہت اندازہ کرا دوں۔ کہ میں ان شاعروں میں سے نہیں ہوں جو محض ایک تخلص پال کر بیٹھ رہتے ہیں۔ اور زندگی بھر میں بس ایک آدھ غزل کہنے کے گنہگار ہوتے ہیں۔ حضرت! یہاں تو بقول شخصے۔ ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

ابھی ہوش سنبھالا ہی تھا کہ گھر میں شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ مشاعروں کے کھیل کھیلے۔ اور آخر پندرہ برس کی عمر ہوگی کہ پہلی غزل اس شان سے مشاعرے میں پڑھی ہے کہ گھر پر بڑی بوڑھیوں نے نظر اتاری اور باہر اس فن کے بڑے بڑے مشاقوں نے اعتراف کیا کہ صاحبزادے نے پالنے ہی میں پیر دکھائے ہیں۔ مطلب یہ کہ شاعری کی ابتدا اسی عمر میں ہوئی۔ جس کے متعلق شاعر کہہ گیا ہے۔ کہ ؎

وہ سن پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں امنگوں کے دن

زندگی ملی تو جو چلے اور بڑھ گئے۔ اب دن رات بس ایک ہی مشغلہ ہے

غزل گوئی اور غزل سرائی۔ جس مشاعرے میں پہنچ گئے بس جھنڈے گاڑ آئے۔ اپنے سامنے کسی کا چراغ نہ جلنے دیا۔ جس طرح میں غزل کہہ دی اس کو اپنا لیا۔ اور خلص شہرت حاصل کی گرہ لگانے میں۔ قصہ کوتاہ کچھ ہی دنوں میں مقامی مشاعروں کے علاوہ دور دور سے بلاوے آنے لگے۔ آج یہاں مشاعرہ ہے تو کل وہاں۔ آج اس شہر میں ہے تو کل اس شہر میں۔ یہ سچ ہے کہ اس طرح تعلیم ضرور ناقص رہ گئی۔ مگر شاعر ہونا مسلّم ہو گیا۔ آواز میں قیامت کا سوز تھا۔ اور دھن بنانے کا سلیقہ خداداد تھا۔ پھر کلام کی لطافتیں۔ مختصر یہ کہ سب کچھ مل جل کر مشاعرہ لوٹنے میں مدد دیتا تھا۔ ایک نمائش کے مشاعرے میں تو تمغہ تک دیا گیا تھا۔ اخباروں میں تصویریں چھاپی گئیں۔ رسالوں کے ایڈیٹروں نے بڑی منت کے خطوط لکھے کہ میں اپنا تازہ کلام بھیجوں۔ بے شمار رسالے اور اخبار مفت آنے لگے۔ اور ان میں میرا کلام بڑے امتیاز کے ساتھ چھپنے لگا۔ بڑے بڑے سالانہ نمبروں میں صرف میری غزل کو جلی حروف میں اور خوشنما حاشیہ کے اندر ایک پورے صفحے میں چھاپا گیا۔ مختصر یہ کہ آپ کی دعا سے شہرت اور مقبولیت کی کوئی کمی نہ رہی۔ یہاں تک کہ کچھ ہی دنوں کے بعد مشق اس قدر بڑھ گئی۔ اور کلام میں کچھ خدا کے فضل سے ایسی پختگی پیدا ہو گئی کہ بہت سے نوجوان اپنی اپنی غزلیں اصلاح کے لئے لانے لگے۔ اور اب ضرورت اس کی پیش آئی کہ ذرا اس فن کا مطالعہ بھی کر لیا جائے۔ کہ یہ فاعلاتن فاعلات آخر کیا بلا ہوتی ہے۔ یہ

سچ ہے کہ پیدائشی اور فطری شاعروں کے لئے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ مگر شاگردوں کو سمجھانے اور استاد بننے کے لئے معلومات کا حاصل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں جتنی کتابیں دیکھیں اتنی ہی طبیعت الجھی کہ یہ ہے کیا خرافات آخر ایک کتابوں کا سٹ مل گیا۔ شاعری کی پہلی کتاب۔ دوسری کتاب۔ تیسری کتاب۔ ان کتابوں کو سلسلہ وار پڑھنے سے خود تو خیر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر دوسروں کو سمجھانے کا مواد ضرور مل گیا۔ اور اب شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان شاگردوں کا مشاعروں میں چمکنا تھا کہ شاگردوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ یہاں تک کہ عالم یہ ہو گیا کہ ہر مشاعرے کے دن درجنوں شاگرد حلقہ باندھے بیٹھے ہیں۔ اور میں ان کو غزلیں لکھوا رہا ہوں۔ کہ یہ مطلع تم لکھ لو اور یہ شعر تم لکھ لو۔ شاگردوں سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو۔ مگر اتنا ضرور ہوتا ہے۔ کہ خود اپنے کو اول تو اساتذہ کی صف میں جگہ ملتی ہے۔ دوسرے استاد کی غزل پر یہ شاگرد داد کا وہ شور مچاتے ہیں کہ مشاعرہ ہی سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ اور اگر کبھی کوئی بدخواہ اعتراض کر بیٹھے تو یہی شاگرد مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ گویا استاد کی اچھی خاصی طاقت ہوتے ہیں یہ شاگرد۔

گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی۔ وثیقہ بندھا ہوا تھا۔ اور باپ دادا بھی اتنا چھوڑ گئے تھے کہ چار کو کھلا کر کھا سکیں۔ لہٰذا فکر معاش

کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ۔ لے دے کے بس فکرِ سخن ہی تھی۔ شاگردوں کو بھی کبھی کسی خدمت کا موقع نہ دیا۔ بلکہ ان ہی کی خدمت جو ہو سکی وہ کی۔ یعنی مفت کی غزلوں کے علاوہ اکثر کو مفت کی روٹیاں بھی مل جاتی تھیں۔ اگر کبھی کوئی شاگرد رساول۔ یا اچار یا اپنے گاؤں سے گڑ وغیرہ بھی لے آیا۔ تو یہی فکر رہتی تھی۔ کہ اس کا بدلہ کیونکر اتارا جائے۔ ایک مرتبہ ایک تنبولی شاگرد نے پانوں کی ڈھولی کی قیمت لینے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ اگلے مشاعرے میں نہ صرف نہایت زوردار غزل کہہ کر ان کو دی بلکہ ان کا ریل کا ٹکٹ بھی خود ہی خریدا۔ غرض تو کیا۔ کہ اس شاعری کو تجارت یا روزگار کی صورت تو کبھی دی ہی نہیں۔ اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کبھی۔

ان ہی حالات میں زندگی بڑے مزے میں بسر ہو رہی تھی۔ کہ ایک دم سے وہ انقلاب آ گیا جس نے دنیا ہی زیر و زبر کر کے رکھ دی۔ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس طرف آ جانا پڑا۔ گھر گیا۔ گرہستی گئی۔ وثیقہ گیا۔ مختصر یہ کہ آپ "واحد حاضر" رہ گئے۔ اور باقی سب کچھ "جمع غائب"۔ اور تو اور کھانے پینے کے لالے پڑ گئے۔ وہ روٹیوں کا سہارا تک کوئی نہ رہا۔ دل میں کہا۔ جان ہے تو جہان ہے۔ ع

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مگر آخر کب تک نہ گھبراتے یہ دیس میں کوئی جان نہ پہچان۔ ایک نفسانفسی

کا عالم ہے سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ مہاجرین میں کچھ جانی پہچانی شکلیں بھی نظر آئیں مگر سب کو اپنی اپنی فکر ہے۔ اور یہاں یہ عالم کہ روز بروز حالت پتلی ہوتی جا رہی ہے سر چھپانے کو تو خیر ایک آگ لگی ہوئی عمارت کے دو پسماندہ کمرے مل گئے مگر پیٹ کی آگ بجھانے کی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ آخر خاندانی وضع کے خلاف روزگار کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ یاد آیا کہ اسی شہر سے ایک رسالہ شہابِ ثاقب سے نکلا کرتا تھا۔ جس کے ایک سالنامہ میں انگور کی خوشنما بیل کے حاشیہ کے اندر اپنی ایک غزل چھپی تھی۔ اور ایڈیٹر صاحب نے اس پر اپنا ایک نوٹ بھی دیا تھا۔ کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ لسان القوم حضرت قیس سونڈوی نے اپنے تازہ رشحات سے ہمارے سالنامہ کو نوازا ہے۔ امید ہے کہ حضرت قیس آئندہ بھی ہم کو اس فخر کا موقع عطا فرماتے رہیں گے۔ چنانچہ اسی رسالے کے دفتر کا رُخ کیا اور پوچھتے پچھاتے آخر اس رسالے کے دفتر پہنچ ہی گئے۔ ایڈیٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا۔ اور وہ حسب توقع دوڑے لیمونیڈ کی بوتل لیکر۔ سگریٹ کی ڈبیہ کھول کر رکھ دی۔ دیا سلائی خود جلائی اور دیر تک ہماری ہجرت پر مسرت کا اظہار کرتے رہے۔ کہ صاحب بہت اچھا ہوا۔ جو آپ تشریف لے آئے

تھوڑی دیر کے بعد موقع دیکھ کر اور ان کو بے حد خلیق پا کر عرض کیا۔

"بھائی جان آ تو گیا ہوں۔ مگر واضح رہے کہ سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں۔ اور خاندانی وضع کے خلاف اب اس پر بھی آمادہ ہوں۔ کہ کہیں ملازمت اختیار

کہ ملی"۔

وہ نہایت اطمینان سے بولے "ملازمت؟ بہرحال اب تو آپ آئے ہیں کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ آپ کے ایسے قابل آدمیوں کے لئے ملازمت کی کہاں کمی ہو سکتی ہے۔ بہرحال آپ نے یہ تو فیصلہ کر ہی لیا ہو گا کہ آپ کس شعبہ میں ملازمت اختیار کرنا پسند کریں گے"۔

عرض کیا "بھائی اپنا شعبہ تو ظاہر ہے کہ زندگی بھر سوائے ادبی خدمات کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اب تک ادبی خدمت کو ذریعۂ آمدنی بنانے کا خیال بھی نہ آیا تھا۔ مگر اب حالات نے مجبور کر دیا ہے"۔

وہ بولے "یہ تو درست ہے۔ مگر ادبی سلسلہ میں ملازمت کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ آپ کے خیال میں کونسا محکمہ ایسا ہے۔ جو آپ کے ایسے ادیبوں کیلئے جگہ نکال سکے گا۔ کم سے کم میری سمجھ میں تو آ نہیں رہا ہے"۔

عرض کیا "آپ محکموں پر نظر نہ ڈالئے۔ میرے لئے تو اتنا ہی کافی ہے۔ کہ مثلاً آپ کا ادارہ ہے۔ اسی میں کوئی خدمت میرے سپرد کر دی جائے"۔

ایڈیٹر صاحب نے دم بخود رہ جانے کے بعد فرمایا "قبلہ بات اصل میں یہ ہے کہ ضرورت تو مجھ کو بھی ہے۔ اپنے یہاں چند لوگوں کی۔ مگر معاف کیجئے گا۔ میں نے

آج تک سوائے غزلوں کے اور کوئی چیز آپ کی نہیں دیکھی ہے۔"

عرض کیا: "اور کیا چیز آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ شجرہ موجود ہے۔ وہ میں دکھا سکتا ہوں۔ خود مجھ کو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ اور کوئی چیز سے مطلب کیا ہے جناب ذرا وضاحت فرمائیں تو کچھ عرض کر دوں۔"

وہ بولے "میرا مطلب یہ ہے کہ نثر غالباً آپ نے کبھی نہیں لکھی۔ نہ آپ کا کبھی کوئی افسانہ پڑھا ہے۔ نہ کوئی تنقیدی مضمون دیکھا ہے۔ نہ کوئی تحقیقی مقالہ۔"

عرض کیا: "جناب والا یہ آپ نے درست فرمایا اور یہ واقعہ بھی ہے۔ اب تک اس قسم کی کوئی چیز لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے۔"

ان کو بہانہ مل گیا۔ آنکھیں گھما کر بولے "اب آپ خود غور فرمائیے۔ کہ کسی ادبی رسالہ کے ادارۂ تحریر میں آپ کو کیونکر شامل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کی شاعرانہ صلاحیت مسلّم ہے۔ مگر اسکی ہم کو ضرورت نہیں۔"

ایسے کور ذوق سے کچھ اور کہنا ہی بیکار تھا۔ ادھر اُدھر کی گفتگو کر کے چلے آئے۔ اور طے کر لیا۔ کہ اب ادھر کا رخ بھی نہ کریں گے۔ مگر اِدھر کا نہ سہی۔ کسی اور طرف کا تو رُخ کرنا ہی تھا۔ ورنہ یہاں تو فاقوں کی نوبت بھی دور نہ تھی۔ کافی دماغ سوزی کے بعد ایک ترکیب ذہن میں آئی۔ کہ اگر کوئی کتب فروش دیوان چھاپنے پر تیار ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ کچھ نہ کچھ حق تصنیف بھی

مل جائے گا۔ دوسرے اس پردیس میں اپنے تعارف کا ایک ذریعہ اس دیوان کی صورت میں نکل آئے گا۔ بالکل الہامی طور پر دیوان کا نام ذہن پر پر نازل ہوا۔ "لیلائے سخن" قیس کی مناسبت سے اس سے بہتر نام اور کیا ہو سکتا تھا۔ دوسرے ہی دن یہاں کے ایک آدھ پبلشر سے ملنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ شہر کے سب سے بڑے پبلشر کا نام اور پتہ پہلے ہی پوچھ رکھا تھا۔ ان کی دکان پر پہنچ کر ان سے شرفِ نیاز حاصل کیا۔ اور آخر اپنا تعارف خود کرایا۔

"نام سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ اس خاکسار کو قیس سعدی کہتے ہیں۔"

وہ حضرت بھی عجیب بدتمیز نکلے کہنے لگے "پھر!"

غصہ تو بہت آیا اس "پھر" پر مگر کیا کرتے وقت آپڑا تھا۔ لہٰذا اپنے آپ کو سنبھال کر کہا "میں نے آپ کے یہاں کی مطبوعہ اکثر کتابیں دیکھی ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طباعت کا جو سلیقہ آپ کو حاصل ہے وہ کسی اور پبلشر کے حصہ میں نہیں آیا ہے۔ اور میں نے طے کر لیا ہے۔ کہ میں اپنا دیوان اگر کسی کو دے سکتا ہوں تو وہ صرف آپ کو۔ کیا نام ہے اس کتاب کا جو ابھی آپ نے شائع کی ہے۔"

وہ ڈکار لیتے ہوئے بولے "کلیہ مرغی خانہ۔"

عرض کیا "جی ہاں کلیدِ مرغی خانہ۔ کیا کہنا ہے اس کتاب کا۔ کتابت ہے تو سبحان اللہ۔ طباعت ہے تو ماشاء اللہ۔ پھر ترتیب اور سجاوٹ۔ دلہن بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کتاب کو میں نے اپنے دیوان کا نام تجویز کیا ہے بشرطیکہ جس کا تخلص بیس ہو اس کے دیوان کا کتنا مناسب نام ہے یہ"

انہوں نے براہِ راست سوال کیا "تو آپ چھپوانا چاہتے ہیں اپنا دیوان؟"

عرض کیا "جی ہاں ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ میں نے اپنے چار دواوین میں سے انتخاب کر کے ایک دیوان مرتب کیا ہے۔ گویا اپنی کائنات شعری کا جوہر نچوڑ لیا ہے۔ اور یہ طے ہوا کہ چھپواؤنگا آپ ہی کے ذریعہ"

انہوں نے کہا "اچھا تو ہم چھاپ دیں گے۔ بہتر سے بہتر لکھائی چھپائی ہوگی۔ کاغذ وہی ہوگا جو کلیدِ مرغی خانہ کا ہے۔ ہم آپ کو ابھی حساب لگا کر بتائے دیتے ہیں۔ کہ آپ کو کیا خرچ کرنا پڑے گا"

ہم نے چونک کر کہا "ہم کو کیا خرچ کرنا پڑیگا۔ غالباً آپ میرا مطلب نہیں سمجھے"

وہ ہم سے زیادہ متحیر ہو کر بولے "تو کیا مطلب ہے آپ کا"

صاف صاف عرض کیا "مطلب یہ ہے کہ آپ لیجئے دیوان اور چھاپئے۔ حق تصنیف طے ہو جائے۔ جو مناسب سمجھئے دے دیجئے"

انہوں نے ایک ایسا قہقہہ لگایا۔ گویا یہ کوئی بہت دلچسپ لطیفہ سنا تھا۔ پھر عجیب تمسخر سے بولے۔

آپ گویا یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا دیوان آپ سے خرید کر خود بیچنے کے لئے چھاپیں۔ آجکل بھلا کون کسی کا دیوان چھاپتا ہے۔ کس کے پیسے فالتو ہیں۔ کہ وہ دیمک کی ضیافت کے لئے دیوان چھاپ کر اپنے یہاں ڈھیر کر لے۔ پیسہ بھی ضائع کرے۔ وقت بھی برباد کرے۔ محنت بھی خواہ مخواہ کی اور جگہ بھی گھیری جائے۔"

ایک آدھ شاعر کے کلام کے مجموعوں کا حوالہ دیا۔ جو حال ہی میں شائع ہوئے تھے۔ اور عرض کیا "آخر یہ مجموعے اور یہ دیوان بھی تو چھپے ہیں"

زانو پر ہاتھ مار کر بولے "اوہو۔ آپ سمجھے نہیں۔ جن شاعروں کا آپ نے نام لیا ہے۔ ان کی تو اس وقت مانگ ہے۔ ان کے مجموعے تو اگر اس وقت ہم کو بھی مل جائیں تو ہم بھی سب کچھ چھوڑ کر چھاپ ڈالیں مگر یہاں ذکر ہے آپ کا ——"

اب تو قابو میں رہنا مشکل تھا۔ ذرا تلخی سے عرض کیا "کیا مطلب آپ کا۔ اگر آپ میرے نام سے واقف نہیں ہیں اور میرے شاعرانہ مرتبہ کو نہیں جانتے تو اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ یہ تو آپ ہی کی کوتاہی ہے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں ایک خاص مقام رکھتا ہوں اس دور کے شعرا میں"

وہ صاحب عجیب بیہودگی سے مسکرا کر بولے "اجی یہ تو سب ہی شاعر کہتے ہیں۔ خیر اس سے کیا مطلب ہم معافی چاہتے ہیں کہ ہم آپ کا دیوان نہیں چھاپ سکتے"

ہم نے اُٹھتے ہوئے کہا "کلام تو خیر میں خود آپ کو چھاپنے کے لئے اب نہیں دے سکتا۔ مگر کتابوں کی تجارت کرنے آپ بیٹھے ہیں تو ذرا اہلِ علم سے بات کرنے کا سلیقہ بھی پیدا کیجئے"

وہ حضرت پہلو بدل کر بولے "اہلِ علم جب کوئی آتا ہے تو ہماری گفتگو بھی دوسری قسم کی ہوتی ہے"

اور ہم نے اس بدتمیزی کا جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ دل ہی دل میں کھولتے ہوئے اس دکان سے باہر آ گئے مگر ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ چودھری صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ یہ چودھری صاحب بڑے اثر و رسوخ کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور میرے کلام کے بڑے دلدادہ ہیں۔ بلکہ نمائش کے مشاعرے میں بھی صدر تھے۔ اور ان ہی کی طرف سے میرے لئے تمغے کا اعلان ہوا تھا۔ ہمیشہ جھوم جھوم کر میری غزلیں سنا کرتے تھے۔ اور اُچھل اُچھل کر داد دیا کرتے تھے۔ آج بھی دُور ہی سے دیکھ کر پہچان گئے۔ اور ایک نعرہ بلند کیا۔

"اخاہ۔ فیّس صاحب ہیں۔ ارے بھئی آپ کہاں۔ بھئی خوب ملاقات ہوئی۔

کب آئے "

عرض کیا "آئے ہوئے تو دو مہینہ سے زیادہ ہو چکے ہیں "

حیرت سے بولے " دو مہینہ سے زیادہ ہو گئے اور کہیں نظر بھی نہ آئے۔ میں تو اکثر مشاعروں میں گیا۔ مگر آپ کو نہ دیکھا "

عرض کیا " جناب والا - اب شعر کی فکر سے زیادہ پیٹ کی فکر ہے۔ وہ فارغ البالی کے زمانے گئے۔ اب تو سب سے مقدم ہے روزی کا ملنا۔ مگر اب آپ مل گئے ہیں تو سب ہی کچھ ہو جائے گا "

اور یہ کہہ کر اپنی تمام داستان ان کو سنا دی۔ کہ کس بے سروسامانی کی حالت میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ اور اگر جلد ہی ملازمت کا کوئی سلسلہ نہ ہوا تو کیا وقت آنے والا ہے ہم پر۔ بڑی ہمدردی اور غور سے تمام حالات سنتے رہے۔ اور سب کچھ سننے کے بعد فرمایا " ارے بھئی گھبرانے کی کیا بات ہے۔ ملازمت آپ کو نہیں تو اور کس کو ملے گی۔ میں ذمہ لیتا ہوں اس بات کا "

منہ مانگی مراد مل گئی۔ جی چاہا کہ اس شریف انسان کے قدموں پہ گر کر جان دے دیں۔ مگر دفورِ جذبات میں قدموں کے بجائے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے عرض کیا " میرا دل خود گواہی دے رہا ہے کہ آپ مل گئے ہیں۔ تو اب میری مشکلات کا خاتمہ ہی سمجھنا چاہیئے "

کہنے لگے " خیر یہ تو آپ کی بندہ نوازی ہے۔ اچھا قبلہ یہ فرمائیے کہ انگریزی

تعلیم کہاں تک ہے؟"

ایسے ذہین آدمی سے اس مہمل سوال کی اُمید نہ ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حضرت نے ہمارا انگریزی نہیں بلکہ اُردو کلام سُنا تھا۔ کبھی انگریزی میں بات کہتے بھی نہ سُنا ہو گا۔ البتہ کبھی کبھی سوٹ پہنے ضرور دیکھا ہو گا۔ اور ممکن ہے کہ یہ غلط فہمی اسی وجہ سے پیدا ہو گئی ہو۔ لہٰذا ہم نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے عرض کیا :-

" بھائی جان انگریزی سے کیا واسطہ، آپ تو جانتے ہوں گے کہ زندگی گزری ہے اُردو کی خدمت میں!"

وُہ بولے :" تاہم کم سے کم میٹرک تو آپ ہوں گے ؟"

عرض کیا :" اجی نہ میٹرک نہ الکٹرک۔ بچپن ہی سے اس شاعری کا ایسا شوق ہوا کہ لکھنا پڑھنا چھوڑ چھاڑ بس اسی کے ہو رہے۔"

وُہ کچھ بُجھ سے گئے :" اوہ تو گویا انگریزی آپ جانتے ہی نہیں۔ یہ تو بڑی مشکل پیدا کر دی آپ نے۔ اب ظاہر ہے کہ آپ کو کوئی باقاعدہ ملازمت تو مل ہی نہیں سکتی۔ مگر خیر۔ آپ یہ کیجئے کہ فی الحال تو میری ایک چھوٹی سی دکان ہے اس کے حساب کتاب کی نگرانی فرمایئے بیٹھ کر۔ اس عرصہ میں اگر کوئی بہتر جگہ مل گئی تو چلے جایئے گا۔ ورنہ میں ہی کچھ نہ کچھ پیش کرتا رہوں گا۔"

خدا کا ہزار ہزار شکر اور احسان ہے کہ اس نے کوئی نہ کوئی سبیل بہر صورت

پیدا ہی کر دی۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ وہ بھوکا اُٹھاتا ہے مگر بھوکا سلاتا نہیں ہے۔ لیجئے اب ہم ایک بارونق بازار میں مڑے۔ بنیان۔ رومال۔ تیل۔ کنگھا۔ آئینہ بیچنے ایک دکان پر بیٹھ گئے۔ صبح آٹھ بجے جاکر دکان کھولنا جھاڑو دینا۔ دن بھر گاہکوں کا خیر مقدم کرنا اور مال بیچنا۔ اور رات کو نو بجے دُکان بند کر دینا۔ ایک کام تو یہ تھا اور دوسرا کام یہ کہ دن بھر کی بکری رجسٹر پر لکھ کر شام کو میزان نکال لیا کرتے تھے۔ مگر یہ دوسرا کام اس قدر نامعقول ثابت ہوا کہ کبھی کبھی تو زندگی سے عاجز آجاتے تھے۔ کبھی تو کیش بکس میں ہیں دو سو باسٹھ روپے تیرہ آنے نو پائی۔ اور کھاتہ میں میزان کل ہے دو سو تیس روپے تیرہ آنے نو پائی۔ اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون صاحب بتیس روپے چپکے سے کیش بکس میں ڈال گئے ہیں۔ دکان کے دوسرے ملازم سے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی تم ہی کچھ یاد کرو۔ آخر وہ اسی لئے بولا اٹھتا کہ "جب آپ اپنے دوست کو غزل سُنا رہے تھے اس وقت جتنے گاہک آئے سب سے دام لے کر کیش بکس میں تو آپ نے ڈال دیئے مگر کھاتہ پر چڑھائے نہیں۔" لیجئے اب کھاتے کے فرضی اندراج ہو رہے ہیں۔ مگر جس دن یہ ہوتا کہ کیش بکس میں سے نکلے تین سو چودہ روپے اور کھاتہ دکھا رہا ہے تین سو چون روپے اس روز تو ہاتھوں کے طوطے ہی اُڑ کر رہ جاتے۔ کہ اب یہ چالیس روپئے کی کمی کہاں سے پوری ہو۔ دکان کے دوسرے ملازم نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا قبلہ صاحب۔ چالیس روپے کا دو تھرموس بیچا تھا۔ اور تھرموس

ہے کہ وہ صاحب بیٹھ گئے تھے آپ کی غزل سُننے دوسروں کے ساتھ۔ بڑی دیر تک واہ واہ کرتے رہے اور پھر ایک دم سے غائب ہو گئے۔ دیکھئے تھرموس کے دام لکھے ہیں:

کھاتے میں تھرموس کے دام چالیس روپے موجود۔ اور اب ہم کو بھی یاد آگیا کہ ہم نے دام لکھ تو لئے تھے مگر وہ بیٹھ گئے تھے کلام سُننے اور بڑے سخن فہم معلوم ہو رہے تھے۔ لہٰذا یہی خیال تھا کہ جاتے وقت دیدیں گے دام۔ مگر وہ چپکے سے نکل گئے۔ بمشکل تمام دوسرے ملازم سے مل ملا کر اور اس کو بھی اسی قسم کا ایک موقع دینے کا وعدہ کر کے کھاتے سے اس اندراج کو مٹایا گیا۔ اور جان بچی۔ کان پکڑ کر توبہ کی کہ آئندہ دکان پر شعر و شاعری کا شغل ہرگز نہ ہوگا۔ اور سوائے دکانداری کے دکان پر بیٹھ کر اور کچھ نہ کریں گے۔ مگر جس نے بھی کہا ہے سچ کہا ہے کہ ۔ ؎

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

دیکھتے کیا ہیں کہ کیف، سیف، حیف، نور، طور، نشور سب کے سب ٹولی بنائے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ اور ایک دم سے آ کر حملہ آور ہو گئے۔ اب کیسے نہ بٹھاتے ان کو اور جب بیٹھ کر ان سے یہ معلوم ہوا کہ مشاعرے سے اُٹھ کر وہ لوگ آ رہے ہیں۔ تو کیسے نہ ان سے فرمائش ہو مشاعرے کی غزلیں سنانے کی۔ اور جب وہ غزلیں سنا دیں تو کہاں کا ہے یہ اخلاق کہ

خود اپنی اسی طرح کی غزل نہ سنائی جائے ان کو۔ بس اتنی سی بات سے مشاعرے
کی سی کیفیت پیدا ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ راہ گیر بھی اکثر سخن فہم
ہوتے ہیں۔ اگر وہ کلام سننے کو ٹھہر جائیں تو کون ان سے کہہ سکتا ہے۔ کہ آپ
چلتے پھرتے نظر آئیں۔ رہ گئے گاہک ان کی بلا سے مشاعرہ ہو یا کچھ وہ تو سن ہی ٹھہرے
سودا لینے اس وقت بھی آجائیں گے۔ ان کو تو اپنے نیز آئندہ بیچنے کے لئے
پچوسنی ورلے بھی بازار اس وقت بھی درکار ہوگا۔ چنانچہ یہ بالکل اتفاق کی
بات ہے کہ جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ شعرائے کرام کے علاوہ سامعین
بھی کچھ زیادہ ہی جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ بہت اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔
اور ان کی آواز سن کر تو راہ گیر کیا معنی پرندے تک ہوا میں معلق ہو کے رہ جاتے
ہیں۔ دریا اپنی روانی چھوڑ دیتا ہے۔ اور کچھ عجیب بات ہے کہ اسی وقت گاہک
بھی کچھ ضرورت سے زیادہ آگئے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ مجمع بھی ضرورت سے کچھ
زیادہ ہی تھا اور سڑک تھوڑی بہت رک گئی تھی۔ لیکن پھر بھی ادھر ادھر دونوں طرف
موٹر کھڑے ہارن دے رہے تھے۔ کہ ناگاہ چودھری صاحب بھی اسی وقت
آموجود ہوئے۔

کچھ پریشان۔ کچھ بدحواس چہرے کا رنگ اڑا ہوا۔ غالباً وہ سمجھے ہوں گے
اس اجتماع کو دیکھ کر کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے یا دکان میں آگ لگ گئی ہے۔ مگر
یہاں کچھ آل پاکستان مشاعرے کا رنگ دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ مگر

پکڑ کر ایک طرف خاموش بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ جب ہم نے غزل پڑھی تو بھی ہمارے کلام پر اچھل اچھل پڑنے والے چودھری صاحب سر پکڑے ہی بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ آنے والے رخصت ہو گئے۔ مجمع چھٹ گیا۔ مشاعرہ ختم ہو گیا۔ اور دکان پر جب کوئی نہ رہا۔ تو چودھری صاحب نے نہایت خاموشی سے اُٹھ کر کہا :۔

"قیس صاحب آج کون تاریخ ہے؟"

عرض کیا "پندرہ"

انہوں نے کہا "میں بصد ادب آدھے مہینہ کی یہ تنخواہ پیش کر رہا ہوں۔ اور آدھے مہینے کی مزید تنخواہ اپنی طرف سے ہدیے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھ کو معاف فرمائیں گے۔"

عرض کیا "بات کیا ہے آخر ــــــ"

کہنے لگے "میں شرمندہ ہونگا اس سلسلہ میں بات کرتے ہوئے۔ صرف اسی قدر عرض ہے کہ میری دکانداری تو ختم ہو کر ہی رہ جائے گی۔ اگر آپ کچھ دن اور یہاں رہے۔ اس عرصہ میں جو نقصانات ہو چکے ہیں۔ ان سے میں بے خبر نہیں ہوں۔"

لاکھ ان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہی مگر وہ بس ہاتھ ہی جوڑتے رہے۔ اور اپنی دکان سے رخصت کر دیا۔ مگر اب اپنے شاعر احباب کے مشورے سے

ہم نے ایک سائن بورڈ اپنے مکان پر ٹانگ لیا ہے۔

ادارۂ اصلاحِ سخن

یہاں کلام میں اصلاح بھی دی جاتی ہے

اور دوسروں کے لئے بہتر سے بہتر کلام

بھی حسبِ فرمائش تیار کیا جاتا ہے۔

یک سخن — آزمائش شرط

صبح سے شام اس سائن بورڈ کے زیرِ سایہ بیٹھے رہتے ہیں۔ آج پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ مگر اب تک صرف دو گاہک آئے ہیں۔ ایک صاحب کی بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایسے پھڑکتے ہوئے شعر ان کو لکھے جائیں کہ بیوی تڑپ کر واپس آ جائے۔ شعر ان کو کہہ کر دے دیئے ہیں۔ آٹھ آنے وہ دے گئے ہیں۔ اور آٹھ آنے بیوی کے آجانے پر دیں گے۔

دوسرے صاحب اس لئے تشریف لائے تھے کہ وہ واقع ہوئے ہیں قوال۔ ان کے ایک حریف قوال نے کسی پچھلی محفل میں ایک چیز گا کر محفل کو لوٹ لیا ہے۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ اسی قسم کی اس سے زبر چیز کہہ دی جائے۔ وعدہ ہوا ایک روپیہ کا۔ اور اگر وہ چل گئی تو جیسی آمدنی محفل میں ہوگی ویسی ہی وہ ہماری خدمت بھی کریں گے۔ یہ چیز ہم تیار کر رہے ہیں ———

ان دو گاہکوں کے علاوہ اب تک اور کوئی نہیں آیا۔ ہاں میں بھولا۔ ایک

صاحبزادے بھی شاگردی کرنے آئے تھے ۔ اور پوچھ رہے تھے کہ وہ جو ہم کو اُستاد کہیں گے ۔ تو ہم ان کو اس کسرِ نفسی کا کیا معاوضہ دیں گے ——

یہ ہے اس دور میں آپ کی شاعری کا حال ۔ اور اس حال میں ہیں آپ کے وہ شاگرد جو آپ کے ادب کو مالا مال کر رہے ہیں ۔

ان کی سسرال

مرزا سے لاکھ بار کہا کہ ہمارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اوّل تو تمہارے حالات کچھ نہایت نامعقول واقع ہوئے ہیں۔ دوسرے ہماری زبان خود ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ بات کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ جو نہ کہنا تھا وہ کہہ گئے۔ مگر مرزا نے ایک نہ سُنی۔ دیرینہ مراسم کا واسطہ دیا۔ احباب نوازی کے خدا جانے کتنے تاریخی حوالے دے ڈالے۔ کہ کس طرح دوستوں نے دوستوں کے پسینہ پہ خون بہایا ہے۔ اور آخر میں آنکھوں میں آنسو بھر کر کچھ اس طرح التجا کی کہ ہم اُن کے ساتھ اُن کی ہونے والی سسرال جانے پر راضی ہو گئے۔ مگر صرف راضی ہونے سے تو کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی تھی کہ با قاعدہ وہی ہر حل

کر لیں۔ کہ وہاں جا کر ہم کو کیا کہنا پڑیگا۔ اور کون کون سی باتیں ایسی ہیں جن کا ہرگز اظہار نہ کیا جائے۔ مرزا نے روانگی سے ایک روز قبل باقاعدہ ریہرسل کرایا۔ کہ بس تم میری تعریفوں کے پل باندھ دینا۔ کہ ایسا لڑکا قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔ پڑھا لکھا۔ سلیم الطبع۔ کماؤ۔ صاحبِ جائداد متعدد تو مکان ہیں۔ جو کرایہ پر اُٹھے ہوئے ہیں۔ دکانوں کا کرایہ الگ آتا ہے۔ خاندان ایسا کہ جس کی شرافت کی قسم کھائی جاتی ہے۔

عرض کیا۔ اگر ان کو معلوم ہو گیا کہ آپ کے بزرگوں میں کچھ سزا یافتہ بھی گزرے ہیں۔ تو؟

مرزا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ اوّل تو پتہ ہی ان کو کیسے چل سکتا ہے۔ اور اگر چل بھی جائے تو تم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہو کہ وہ حضرت ذرا کانگریسی واقع ہوئے تھے۔ سیاسی مذاق تھا۔ لہٰذا نظر بند کر دیئے گئے تھے۔

پوچھا۔ اور پڑھا لکھا جو میں نے کہہ دیا۔ اور وہ بیٹھ گئے امتحان لینے تو میں کس طرح بھانپ سکونگا۔

مرزا نے ڈانٹ دیا۔ بکتے ہیں آپ۔ ارے میاں کون لیتا ہے امتحان۔ بس تم ذرا ٹھونس گانٹھ دینا۔ پھر کسی کی ہمت ہی نہیں ہو سکتی۔ سب سے زیادہ ان کو خاندانی شرافت کا خیال ہے۔

ہم نے کہا۔ اور اسی سلسلہ میں تم سب سے زیادہ گڑبڑ ہو۔ اسے بھئی تعلیم کا حال

یہ ہے کہ گو یچوابٹ نہ سہی کچھڑی اُرد و ٹل تو پاس ہی ہو۔ چاندا و نہ سہی۔ مگر اکثر قیمتی چیزیں تمہارے پاس ہیں۔ ایک تو چاندی کا خلال ہی میں دیکھ چکا ہوں۔ ایک فونٹین پن بھی یاد پڑتا ہے مجھ کو۔ قمیص کے بٹن بھی غلطے دکھا دئیے ہیں۔ مگر خاندان کا تو یہ حال ہے کہ کوئی کہتا ہے کہ میراثی ہو۔ اور خان صاحب تو قسمیں کھا رہے تھے کہ یہ لوگ بندر والے ہیں۔

مرزا نے اُلجھ کر کہا۔ یہ سب غلط ہے۔ بیہودہ ہیں یہ لوگ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ والد صاحب کا انتقال کچھ ایسا دواد می میں ہوا۔ کہ میں خود ان سے پوچھ نہ سکا۔ کہ ہم لوگ دراصل ہیں کیا۔ مگر اب بھی تو تمہارا کمال ہے۔ کہ وہاں سب کو ایسا شیشہ میں اتار دو کہ بات بھی بن جائے اور ناک بھی اونچی رہے۔

ہم نے کہا۔ میاں تم کو ناک اونچی کرنے کی فکر ہے۔ اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جانے سے پہلے کم سے کم اپنی ناک کا تو بیمہ کرا ہی لوں۔ اللہ جانے کیا افتاد پڑے۔

کہنے لگے۔ خیر یہ تو مذاق ہے۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ پہلے سے ہم دونوں یہ طے کرلیں۔ کہ وہاں کیا بیان دینا ہے۔ تاکہ ہم دونوں کے بیان میں کوئی فرق نہ ہو مثلاً قوم کیا ہونا چاہیئے میری۔

عرض کیا۔ نہ بہت اونچی نہ بہت نیچی۔ کچھ واجبی سی ہو۔ مرزا تو کہلاتے ہی ہو بس مغل ٹھیک ہے۔"

کہنے لگے۔ صرف اتنا کافی نہیں۔ میں بتاؤں۔ تم یہ کہنا کہ شاہانِ مغلیہ سے ان کا سلسلہ ملتا ہے۔

ہم نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بجلد پٹواؤ گے۔

چاپلوسی کرتے ہوئے بولے۔ کون مار سکتا ہے میرے بھائی کو۔

ہم نے جلدی سے کہا۔ بھائی تو خیر نہ کہو۔ ورنہ میرا خاندان بھی گڑ بڑ ہو کر رہ جائے گا۔ دوستی کا رشتہ کافی ہے۔ دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت۔

کہنے لگے۔ اگر مہراوپاندان خرچ وغیرہ لکھوانے پر زور دیں۔ تو انکار ہرگز نہ کرنا۔

ہم نے کہا۔ انکار تو نہیں کرونگا۔ مگر گواہی کے دستخط کی امید بھی نہ رکھنا۔ اب تو دام چکر میں آئے۔ پہلے کچھ غور فرماتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ وہاں دیکھا جائیگا۔ ابھی تو کل جانا ہے۔ تم بھی غور کرو۔ میں بھی غور کرتا ہوں۔

وہ حضرت تو یہ کہہ کر اپنے انتظامات میں لگ گئے۔ اور ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا۔ کہ اس موقع پر بھاگ جانا مناسب رہے گا۔ یا صفائی سے کام لے کر جانے سے انکار کر دینا ہی اچھا ہے۔ اس لئے کہ یہ طے تھا کہ یہ حضرت وہاں طرح طرح کے جال پھیلائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ ان لوگوں کو پھانس بھی لیں۔ مگر خود بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور ان حضرت کے ساتھ ہم خواہ مخواہ پھنس کر

بیٹھ گئے۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ مروت بھی آخر کوئی چیز ہے۔ کس خوشادو سے بیچارہ بار بار کہہ رہا ہے۔ جہاں تک ہو سکے گا اپنے کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ پھر جو اللہ کو منظور ہے دیکھا جائے گا۔

دوسرے دن کچھ نہ پوچھیئے مرزا صاحب کی بہار۔ متعدد صابنوں سے گھنٹوں غسل فرمانے کے بعد جب بال بال موتی پروئے اپنی جامہ زیبی کے کمالات دکھاتے آپ باہر تشریف لائے تو پہلی نظر میں تو ہم کو بھی شریف ہی محسوس ہوئے۔ مگر رفتہ رفتہ تجربے کی خامیاں اجاگر ہونے لگیں۔ مثلاً آپ نے سرمہ بھی لگایا تھا۔ ایک گال میں متعدد گلوریاں بھی ٹھونسی تھیں۔ اور کوئی نہایت واہیات قسم کا تیز خوشبو والا دماغ پاش پاش کر دینے والا عطر بھی استعمال کیا تھا۔ اور تو اور کورے لٹھے کا پاجامہ پہن کر جب آپ کھڑ کھڑ کرتے ہوئے چلتے تھے۔ تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مردہ اپنے کفن میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ ہم نے مرزا صاحب کی یہ سج دھج دیکھ کر ابھی کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا۔ کہ وہ خود بول اٹھے۔

کیوں بھئی ٹھیک ہے؟

ہم نے کہا۔ بس اب تو یہی دعا ہے۔ کہ خدا کرے لڑکی والے نہایت ہی تھرڈ کلاس بدذوق ہوں۔

حیرت سے بولے۔ واہ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ وہ لوگ بڑے خاندانی لوگ ہیں۔ لڑکی کا ایک چچا تو وکیل ہے۔

ہم نے کہا۔ بس تو استاد تم پر مقدمہ انشاء اللہ ضرور چلے گا۔

کہنے لگے۔ یعنی خواہ مخواہ بھی۔ آخر بات کیا ہے؟

ہم نے کہا۔ وہ صورت دیکھتے ہی پہچان لیں گے کہ نہ یہ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ نہ شریف خاندان ہے۔ اور نہ صحبت یافتہ ہے۔ یہ آپ سے سرمہ لگانے کو کس نے کہا تھا۔ اور یہ لوفروں کی طرح گلمہ۔ پان ٹھونسی گئی ہیں گال میں۔ یہ کس صحبت کا اثر ہے۔ پھر کورے لٹھے کا پاجامہ۔

کہنے لگے۔ بھئی میں نے تو نئے کی وجہ سے پہن لیا تھا۔ ورنہ دھلا ہوا پاجامہ بھی موجود ہے۔ ابھی لو۔

خدا خدا کر کے ان حضرت کو کسی نہ کسی حد تک۔ آدمی بنا کر لے چلے اپنے ساتھ۔ راستہ بھر دل دھڑکتا رہا۔ کہ خدا ہی آج عزت آبرو کے ساتھ گھر لائے۔ کہ آپ نے دور ہی سے ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ہے مکان۔ اور اب جو ہم نے اس مکان کی طرف دیکھا۔ تو دل میں ایک مرتبہ پھر خیال آیا کہ مولانا ابھی سویرا ہے۔ تانگے سے پھاندو۔ اور بھاگو سر پر پیر رکھ کر۔ مگر فرار ہونے کا ارادہ ابھی خام ہی تھا کہ تانگہ ٹھہر گیا۔ اور ایک نہایت خوفناک بزرگ نے اتنے زور سے "السلام علیکم" مارا کہ ہم نے بلبلا کر کہا: "وعلیکم السلام"

چھ فٹ کے یہ بزرگ جن کے تمام سینہ پر داڑھی چھائی ہوئی تھی۔ آگے

بڑھے۔ اور مصافحہ کرنے کے بعد ہمارے ساتھ ایک کمرے میں سے ہو کر پہنچے۔ جہاں پہلے سے چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب بٹیر سے کچھ بڑے اور تیتر سے کچھ چھوٹے چشمہ لگائے کھیسیں نکالے بیٹھے تھے۔ دوسرے صاحب یا تو مینیجر تھیٹر تھے۔ ورنہ جادو کا تماشہ دکھاتے ہوں گے۔ مونچھیں بیرہ دہی پروفیسر معشوق علی مسمریزم والے کا سا تاؤ اور گلے میں اسی قسم کی بو۔ ایک صاحب جو سب سے زیادہ معتبر نظر آتے تھے۔ داڑھی کو دو حصوں میں تقسیم کئے داڑھی کے بیچوں بیچ کچھ عجیب ریڈ کلف بنے بیٹھے تھے۔ جو بزرگ ہم لوگوں کو اندر لائے تھے۔ انہوں نے تعارف کی رسم ادا کی۔

آپ ہیں حکیم مرزا صاحب عالم صاحب۔ آپ ہیں عمر دراز بیگ صاحب وکیل۔ اور آپ ہیں عہدیدار دولت علی صاحب۔ اور یہی عہدیدار صاحب جو ہیں وہ صاحبزادے اور یہ ان کے دوست۔

ہم لوگوں کو بڑے تپاک سے بٹھا دیا گیا۔ اور مرزا خلاف معمول نہایت مہذب بن کر بیٹھ گئے۔ کچھ شرمائے ہوئے۔ کچھ گھبرائے ہوئے۔ پہلے خاصدان کا دور چلا۔ پھر سگریٹ سے دمکایا گیا۔ اور آخر ہمارے رہنما۔ چھ فٹ کے مسلم بزرگ نے کہا کہ "اب آپ لوگ تو ذرا تشریف رکھیں۔ میں ان صاحبزادے کو لیے جا رہا ہوں اندر۔ بات یہ ہے کہ مستورات دیکھنا چاہتی ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ عملداری مستورات ہی کی ہے۔"

پیچھے ہم تو باہر ہی رہ گئے۔ اور مرزا صاحب روانہ کر دیئے گئے اندر۔ اُن کے جاتے ہی سب سے پہلے ان ہی آدھے تیز آدھے بٹیر بزرگ نے نہایت مہین سی آواز میں پوچھا۔

"کیا شغل ہے ان صاحبزادے کا؟"

ہم نے نہ جانے کیا کہنا چاہا۔ مگر کہا صرف یہ کہ "اجی صاحب مشغلہ ہی کیا ہوتا۔ جائداد خدا کے فضل سے کافی ہے۔ مکانات۔ دکانیں۔ انہی کے انتظام میں مصروف رہتے ہیں۔ بینڈ ماسٹر نما بزرگ بولے۔ مگر میں نے سنا تھا کہ سرکاری ملازم بھی ہیں۔

اب بتایئے ہم کیا کہتے۔ مگر چپ رہنا اور بھی برا تھا۔ لہذا کچھ بولنے کی کوشش کی۔ جی ہاں۔ وہ ملازمت تو یوں سمجھئے کہ یونہی ذرا دل بہلانے کے لئے کر لی ہے ورنہ ان کے میاں خود کیا کمی ہے۔ کہ ملازمت کرتے پھریں۔ داڑھی کے تقسیم کنندہ محترم بولے "کہاں ملازم ہیں؟"

کتنا معمولی سا سوال تھا۔ مگر کیسا ٹیڑھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ کہیں ملازم ہی نہ تھے۔ مگر واہ ری ہماری حاضر جوابی "جی یہیں لاہور میں"۔

بینڈ ماسٹر صاحب نے کہا "میرا مطلب یہ ہے کہ کس محکمہ میں؟"

اب تو گویا صاف مارے گئے۔ محکمہ کی تفتیش نہایت خطرناک تھی۔ لہذا

عرض کیا "جی وہ دیکھئیے بھلا سا نام ہے اس کا۔ دماغ میں ہے زبان پر نہیں آتا"

ان بزرگ نے مشکل آسان کردی "انکم ٹیکس سنا تھا میں نے"

ہم نے بڑی متانت سے کہا "جی ہاں اور کیا۔ ایک قسم کا انکم ٹیکس ہی سمجھ لیجئے"

مگر وہ مُھرسے وکیل جرح شروع کردی۔ ایک قسم کا انکم ٹیکس سمجھ لوں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ ارے بھئی انکم ٹیکس تو بس انکم ٹیکس ہی ہوتا ہے"

ہم نے اپنے اوپر جبر کرتے ہوئے کہا "جی نہیں وہ کچھ انکم ٹیکس بھی ہے اور کچھ انکم ٹیکس نہیں بھی ہے۔ ابھی دیکھئے وہ آتے ہیں۔ تو میں پوچھ کر بتاتا ہوں۔ آدھے تیتر آدھے بٹیر صاحب بولے "سیلز ٹیکس کا محکمہ تو نہیں؟"

ہم نے آنکھیں گھما پھرا کر کہا "غالباً میرا خیال ہے کہ آپ قریب قریب ٹھیک سمجھ رہے ہیں"

داڑھی کے تقسیم کنندہ بزرگ نے بحث بدلا "صاحبزادے کی تعلیمی حالت کیا ہے؟"

ہم نے کہا "کیا کہنا ہے صاحب! ماشاءاللہ بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اپنے زمانے کے نہایت ہونہار طالب علم سمجھے جاتے تھے"

بینڈ ماسٹر صاحب بولے "علی گڑھ میں بھی پڑھ چکے ہیں غالباً"

ہم نے تم کی بزرگی کہا: عرض تو کیا کہ علیگڑھ کے نہایت ہونہار طالب علم سمجھے جاتے تھے "

شکر ہے کہ وہ بزرگ محترم جو مرزا کو سلام کر گئے تھے ۔ مرزا کو چھوڑ کر آ گئے اور ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے "صاحب! اس زمانہ میں ایسے شریف لوگ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں ۔ کیا مجال ہے جو میرے کسی سوال کا جواب ٹھیک دیا ہو ۔ ہیڈ ماسٹر نما بزرگ نے فرمایا ۔ بھائی صاحب یہ صاحبزادے کس محکمہ میں ملازم ہیں ؟

وہ بزرگ بولے "اکسائز کہتے ہیں "

اور ہم نے نعرہ بلند کیا "جی ہاں اکسائز اکسائز ۔ ٹھیک ہے اکسائز "

ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہنس کر کہا "کہاں اکسائز ۔ کہاں انکم ٹیکس ۔ کہاں سیلز ٹیکس "

چھ فٹ کے بزرگ نے ہم سے کہا "تو گویا خاندانی سلسلہ شاہانِ اودھ سے ملتا ہے "

ہم کو بتایا تھا ۔ شاہانِ مغلیہ سے سلسلہ ملانے کو اور خود لا بیٹھے شاہانِ اودھ سے ۔ اب بتائیے ہم کس سے ملاتے ۔ ہم نے عرض کیا "جی ہاں ۔۔۔ ددھیال کی طرف سے سلسلہ ملتا ہے ۔ شاہانِ اودھ سے اور ننھیال کی طرف سے شاہانِ مغلیہ سے "

آدھے تیتر آدھے بٹیر صاحب نے کہا "شجرہ تو مل سکے گا"

ہم نے جلدی سے کہا "کیوں نہیں یقیناً شجرہ ہوگا ان کے پاس"

چھ فٹ کے بزرگ نے کہا "بی۔ اے کس سنہ میں کیا ہے؟ یہ تو برخوردار نے بتایا کہ گریجوایٹ ہیں۔ مگر سنہ میں پوچھنا بھول گیا تھا"

ہم نے کہا "سنہ تو مجھ کو بھی یاد نہیں"

انہی بزرگ نے کہا "گورنمنٹ کالج ہی سے کیا ہے بی۔ اے"

ہیڈ ماسٹر صاحب بولے "گورنمنٹ کالج یا علیگڈھ؟"

"جی ہاں دونوں۔ بات یہ ہے کہ علیگڈھ میں پڑھے۔ اور امتحان گورنمنٹ کالج میں دیا"

چھ فٹ کے بزرگ نے کہا "لڑکا مجھ کو بے حد پسند ہے خصوصاً اس لئے کہ میری لڑکی خود انٹرمیڈیٹ تک پڑھی ہوئی ہے۔ مگر صاحبزادے کچھ اس قدر کم سخن اور شرمیلے واقع ہوئے ہیں۔ کہ پڑھی لکھی لڑکیاں تو ایسے نوجوانوں کو انگلیوں پر نچا دیا کرتی ہیں۔ تو ان کے والد صاحب امروز فردا میں آنے والے ہیں"

لیجئے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان حضرت نے والد صاحب کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔ حالانکہ وہ بیچارے نہایت ہی لاولدی میں بغیر اپنی قوم بنائے مر چکے تھے۔ اب معلوم نہیں والد کا انتظام کہاں سے کریں گے۔ بہرحال ہم نے کہا معلوم نہیں

مجھ سے تو کچھ ذکر آیا نہیں ۔"

وہ بزرگ بولے ۔" جی نہیں ۔ ابھی کہہ رہے تھے ۔ کہ والد صاحب آنے والے ہیں ۔ جائیداد کے بٹوارے کے سلسلہ میں وہی لڑکی کے نام ایک آدھ مکان لکھ دیں گے ۔

خدا کا شکر ہے کہ نوکر نے چائے لا کر لگا دی ۔ ورنہ خدا جانے اور کتنے جھوٹ بولنا پڑتے ۔ چائے کے ساتھ ہی مرزا صاحب بھی اندر سے نہایت مرخرو واپس تشریف لائے ۔ اور چائے نوشی میں شریک ہو گئے ۔ عین اسی وقت ان بینڈ ماسٹر نما بزرگ نے مرزا صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

" آپ نے سبجیکٹ کیا لئے تھے ؟"

مرزا صاحب نے ایک بڑا سا کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا ۔ تاکہ بجائے ان کے ہم جواب دیں ۔ ہم نے کہا ۔

" یہ تو آرٹس میں تھے ۔"

اور اب ہم نے جلدی کرنا شروع کر دی ۔ اس لئے کہ سوالات کا رُخ خطرناک ہوتا جا رہا تھا ۔ ہم نے کہا ۔" مرزا صاحب اب ہم کو فوراً واپس بھی پہنچنا ہے ۔ گھر پر میٹنگ ہے ۔ اور سب منتظر ہوں گے ۔"

آدھے تیتر آدھے بٹیر صاحب نے کہا ۔" ابھی بھی کیا جلدی ۔ چلے جائیے گا ۔ ہاں

برخوردار تم نے کس ڈویژن میں پاس کیا بی۔ اے ؟"

مرزا بول اٹھے " فسٹ "

چھوٹنٹ کے بزرگ نے کہا " ماشاء اللہ۔ اور کس سنہ میں۔؟"

مرزا نے جلدی سے کہا " ۱۹۲۶ء میں "

داڑھی کے تقسیم کنندہ نے کہا " خوب تو گویا آپ ۱۹۲۶ء میں گورنمنٹ کالج میں تھے "

مرزا نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا " جی ہاں بس امتحان دیا تھا "

ہم نے پھر کہا " صاحب معاف کیجئے ذرا۔ وہ میٹنگ ان سے زیادہ میرے لئے ضروری ہے۔ لہذا کم سے کم مجھ کو تو اجازت ہی دیجئے "

مرزا نے کہا " نہیں میں بھی اجازت لے کر جا رہا ہوں "

اور بمشکل تمام وہاں سے نکل سکے۔

راستہ بھر تو ہم کچھ نہ بولے۔ مگر آخر غصہ کے باوجود یہ تو پوچھنا ہی تھا۔ کہ والد آپ کے کیونکر زندہ ہو گئے؟ لہذا عرض کیا۔

بھئی اور تو جو کچھ ہوا وہ ہوا۔ مگر یہ آپ کے والد امروز فردا میں کہاں سے آجائیں گے؟

مرزا نے کہا۔ بھئی خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔ بات یہ ہوئی کہ میرے ہونے والے خسر نے کہا کہ " والد صاحب کیا باہر ہیں؟ " میرے منہ سے نکل گیا۔ " جی ہاں "

بس جی ہاں کو پھر نبھانا پڑا۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ عزیز مرزا کو والد بننے پر تیار کر لوں گا۔ مگر یاد آج کا معاملہ رہا بڑا ٹھاٹھ دار بڑے مرعوب ہوئے ہیں یہ لوگ۔

ہم نے کہا۔ دیکھو مرزا آج سے بعد مجھ سے امید نہ رکھنا۔ کہ میں پھر تمہارے اس قصے میں کسی حیثیت سے شرکت کر دُنگا۔ خدا کی قسم سخت چغد تھے یہ لوگ۔ ورنہ ہم دونوں میں سے کوئی صحیح سلامت واپس نہ آسکتا۔

مرزا نے اطمینان دلادیا کہ یہ سب نکاح ہونے تک جھگڑے ہیں۔ اس کے بعد تو ہماری عزت اُن کی عزت بن جائے گی۔ اور پھر اگر جھوٹ کھل بھی گیا تو اس پر وہ خود پردہ ڈالیں گے۔

وہ دن اور آج کا دن مرزا سے پھر ہم نے ملنا گوارا نہیں کیا۔ سنا ہے کہ عزیز مرزا ان کے والد بنے ہوئے ہیں۔ اور آج ہی کل میں شادی کی تاریخ ٹھہرنے والی ہے۔ کیا دنیا واقعی اتنی ہی اندھی ہے؟

اے روسیاہ تجھ سے تو......

آج میرے ایک مستقل دوست، عارضی پرمٹ پر ہندوستان سے تشریف لا رہے تھے اور میں بغلیں جھانکتا پھرتا تھا اور کوئی چیز جھانکنے کے لئے تھی ہی نہیں کیا کرتا۔ نہ مکان ایسا کہ ان کو ٹھہرا کر فخر سے ذرا کھنکھار سکتا۔ نہ خانہ و سامان ہی ایسا کہ وہ حیران ہوتے اور میں بڑے استغنا سے سیٹی پہ کوئی فلمی دھن پھونک سکتا۔ یہاں تو یہی فکر تھی کہ وہ بھی کیا کہیں گے کہ اتنے دن تک کیا محض بھاڑ جھونکتے رہے ہیں اور اگر اسی طرح رہنا تھا تو ہنگامہ سے بھی دو سال پہلے ہجرت کی آخر کیا ضرورت تھی۔ آج پہلی مرتبہ رہ رہ کر ان کوتاہیوں پہ دل مسل رہا تھا جو عام لوٹ کے وقت سرزد ہوئی تھیں۔ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں

مکان چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے والے بھاگ گئے اور ان پر قبضہ کرنے والوں نے قبضہ بھی کیا۔ لوگوں کو نئے بنائے گھر مل گئے۔ جن کے پاس لیٹنے کو چارپائی اور بیٹھنے کو مونڈھا تک نہ تھا وہ مسہریوں پہ اینٹھے اور صوفوں پہ اُچکنے لگے۔ ایک پڑوسی نے تو خود ہم کو اپنا گھر دکھا کر مشورہ لیا تھا کہ اس کے کس کمرے میں کیا کرنا چاہیئے۔ اور ہم نے دو دن تک ان کو محض گھر میں بسنا سکھایا تھا۔ ورنہ وہ یقیناً ڈرائنگ روم میں کھانا کھانے کی اور کھانے کے کمرے میں آرام فرمانے کی کوشش کرتے۔ مگر اس کے باوجود وہ ایک دن اپنے بڈ روم میں احباب کے ساتھ اس لئے گنا چوس رہے تھے کہ بقول ان کے بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں لیٹی ہوئی ملغوزے کھا رہی تھیں کہ آنکھ لگ گئی اور اب ان کو جگانا مناسب نہ تھا۔

ان حضرت کو کبھی انار کلی میں ڈریس گون پہنے ٹہلتے دیکھا۔ کبھی ڈنر سوٹ پہنے عین دوپہر کو نہر کے کنارے پچنے تناول کرتے ہوئے نظر آئے۔ اور بیگم صاحبہ کے لئے تو متعدد مرتبہ تیمچر کی ضرورت پیش آئی جو اونچی ایڑی کا جوتا پہن کر چلنے کی مشق میں گر جایا کرتی تھیں۔ کچھ دن بعد یہ حضرت پڑوس کے مکان سے تشریف لے گئے اس لئے کہ آپ کو کوئی اور مکان مع اپنے سامان کے مل گیا تھا۔ اور حالانکہ چلتے وقت آپ نے یہ مکان ہم ہی کو سونپا تھا۔ کہ

اب آپ اس میں اُٹھا لائیں۔ مگر اس جو ٹھہرے بیٹھے رہے اپنے اُسی ڈربے میں جس کا عالم یہ ہے کہ یا تو ہم خود رہیں یا سامان کو رکھیں اور اگر دونوں کے لئے گنجائش نکالنا ہے تو اپنے میں اور اپنے سامان میں فرق محسوس نہ کریں۔ اور اس حقیقت کو کبھی ذہن سے نہ نکالیں کہ بابا یہ دنیا سرائے فانی ہے اس میں سو برس کے سامان ہرگز نہ کرائیے کہ کل کی خبر تجھ کو نہیں ہے۔ چنانچہ ہم نے یہی کیا ہے کہ خدا کے مسبب الاسباب ہونے پر پورا ایمان رکھتے ہوئے اسباب جمع کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور اگر اسباب جمع بھی کرتے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اسباب باہر رہتا اور ہم گھر میں یا اسباب گھر میں اور ہم باہر۔ مگر ہم نے یہ صورت ہی پیدا نہ ہونے دی اور ہم اور ہمارا اسباب دونوں نہایت مرنجاں مرنج طریقہ پر اسی گھر میں مدت سے رہتے چلے آ رہے ہیں اور چونکہ ہم لامکاں کے بندے ہیں لہٰذا اس سے مکان کی شکایت بھی نہیں کر سکتے۔

صاحب ہمارے مکان میں دو قلمدان کی نسل کے کمرے ہیں۔ ایک کمرے میں ایک طرف باورچی خانہ ہے دوسری طرف ایندھن رکھنے کی جگہ۔ اور دیوار میں بڑی بڑی کیلیں گاڑ کر کچھ تختے بیوی نے نہایت سلیقے سے لگا دیئے ہیں۔ جن پر برتن رکھے جاتے ہیں۔ ایک کونے میں تلے اوپر گھڑے

مٹکے اور مٹکیاں رکھی ہیں۔ کسی میں آٹا ہوتا ہے کسی میں ماش کی دال کسی میں چنے کی دال۔ کسی میں گڑ۔ کسی میں لہسن پیاز اور ایک مٹکی میں بچی ہوئی روٹی کے سوکھے ٹکڑے اسی کے قریب پینے کے پانی کی گھڑونچی ہے باقی ہر طرف چوہوں کے بل۔

دوسرے کمرے میں دو پلنگ بچھے ہوئے ہیں اور ان دو پلنگوں کے بعد جو جگہ بچتی ہے اس میں تلے اوپر کپڑوں کے بکس رکھے ہوئے ہیں۔ دو الماریاں بھی اس کمرے میں ہیں۔ جن میں سے ایک میں دوا کی شیشیاں اس ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں کہ انسان نہایت آسانی سے آنکھ میں بدہضمی کی دوا ڈال سکتا ہے۔ اور بدہضمی ہو جائے تو آنکھ کی دوا پی سکتا ہے۔ آج تک کا تجربہ ہے کہ اس طرح سے دواؤں کا استعمال عموماً فائدہ پہنچاتا ہے۔ دواؤں کی شیشیوں کے علاوہ اس الماری کے پہلے تختے پر سر میں ڈالنے کا تیل بھی ہے تاکہ بوقت ضرورت خواہ سر میں تیل ڈال لیجئے خواہ ٹنچر۔ ایک آئینہ بھی ہے جس میں یہ شیشیاں اپنا منہ دیکھا کرتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کبھی الماری کے اسی تختہ پر ایک کنگھا بھی پایا جاتا تھا مگر امتدادِ زمانہ کے ماتحت اب اس کے چند دندانے باقی رہ گئے ہیں۔ الماری کے دوسرے تختہ پر سلائی کا سامان رہتا ہے۔ یعنی وہ قمیصیں جو پہلے والدین کے کام آئیں اور اب کٹ کر کسی بچے کے لئے سل رہی ہوں یا باپ کا وہ پتلون جو اب بیٹے کے نکّر کی صورت میں

جنم پلنے کی حالت میں مبتلا ہو۔ ایک نوک ٹوٹی قینچی۔ ایک دھاگے کا گولہ جس میں ایک آدھ سوئی بھی اکثر پیوست دیکھی گئی ہے کچھ پھٹے ہوئے موزے کچھ ٹوٹے ہوئے بٹن ایک آدھ کمر بند یہ ہے اس دوسرے تختے کا سرمایہ۔ الماری کے تیسرے تختے کے متعلق مؤرخ حیران ہے کہ اس کو کتب خانہ کہے یا نعمت خانہ اس پر کبھی کبھی کتابیں دیکھی گئی ہیں اور بسا اوقات ان ہی میں ملی جلی اچار کی ایک آدھ بوتل۔ یا میلاد شریف سے آئے ہوئے بتاشے۔ اس کی پہچان کا ایک عام طریقہ یہ ہے کہ اگر الماری کے اس خانے کی طرف دیمک دوڑ رہی ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس پر کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور اگر چیونٹیوں کی قطار نظر آئے تو یقیناً بتاشے ہی ہوں گے۔ اور جب دونوں نہ ہوں تو علم سے بیزاری کا ماتم یا قحط کا رونا جو مناسب سمجھیئے اختیار کر لیجئے۔

اس کمرے کی دوسری الماری عموماً مقفل رکھی جاتی ہے تاکہ آنے جانے والوں کو یہ شبہ ہو سکے کہ چرانے کے قابل کچھ چیزیں اس گھر میں بھی ہیں مگر متعدد مرتبہ اسی الماری کے قریب اکثر چوروں کو عرق انفعال میں غرق پایا گیا ہے۔ اس الماری میں سب سے زیادہ قیمتی چیز اس مکان کے کاغذات ہیں جو ہندوستان میں رہ گئے۔ اور جس میں آجکل ایک سردار صاحب اپنے کیس دھویا اور سکھایا کرتے ہیں۔ غالباً بیگم صاحبہ کا خیال یہ ہے کہ اگر یہ کاغذات کوئی لے اُڑا تو

پھر اس مکان کو یہاں منگانا بھی ممکن نہ رہے گا۔ دوسری چیز نکاح نامہ ہے جس پر ہم نے بیس ہزار کا مہر لکھا ہے اور بیگم صاحبہ مسلسل انتظار کر رہی ہیں کہ یہ رقم مل سکنے کی امید پیدا ہو تو مہر کا دعویٰ کر دیں۔ ان دو دستاویزوں کے علاوہ جائیداد منقولہ میں ایک تو ہے سرمہ دانی جو کہا جاتا ہے کہ چاندی کی ہے۔ اور یہی روایت ایک خلال کے متعلق بھی سینہ بسینہ چلی آئی ہے۔ قیمتی دھاتوں میں سے تو خیر یہی دو چیزیں ہیں مگر ان کے علاوہ دوسرے نوادر بھی اس الماری میں ہیں۔ مثلاً ایک گھڑی جو اب وقت غالباً اس لئے نہیں دیتی کہ بڑا برا وقت آ لگا ہے۔ دو چائے کی پیالیاں جن کے کنڈے اب تک سلامت ہیں اور جو مہمانوں کے سامنے عزت رکھ سکتی ہیں۔ ایک ڈبل روٹی کاٹنے کی چھری جو ہنگامے کے زمانے میں بیگم صاحبہ تکیہ کے نیچے رکھ کر سویا کرتی تھیں کہ شاید میدانِ جہاد میں جانا پڑ جائے۔ اور ہاں چینی کی بوتل تاکہ بچے اس کو پھانک نہ جائیں۔

ان دو الماریوں کے علاوہ اس کمرے میں ایک مینٹل پیس بھی ہے جس پر ہم لوگ رات کو لالٹین اور دن کو پاندان رکھا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ صرف یہی جگہ ایسی ہے جس پر ہم لوگ آزادی سے جو چیز چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسی مینٹل پیس پر منے کو اپنا کھویا ہوا جوتا بھی مل جاتا ہے اور ہم کو سگریٹ کے اتنے ٹکڑے کہ اگر تمباکو نکال کر پائپ پینا چاہیں تو

دو دن تک یہ تمبا کو کافی ہو۔ بیگم صاحبہ اسی منزل میں یہ ہاتھ بڑھا کر اپنے بالوں کے کانٹوں سے لے کر بچوں کے کلوٹ تک جو چاہتی ہیں رکھ دیتی ہیں۔ اور بسکٹ کے ٹکڑوں سے لے کر چھالیہ کے دلنے تک جو چاہتی ہیں اُٹھا لیتی ہیں۔

دُنیا حیران ہے اور ہم نے اپنے گھر کا یہ بھید آج تک کسی کو نہیں بتایا ہے کہ اس مختصر سے کمرے میں اور ان دو چارپائیوں پر ہم دو میاں بیوی اور تین بچے کیونکر رات بسر کرتے ہیں۔ بہر حال اب تو بتانا ہی ہے لہذا عرض یہ ہے کہ ہوتا یہ ہے کہ ایک چارپائی جیسے ہماری۔ ایک بیگم صاحبہ کی۔ چھوٹا بچہ ماں کے پاس منجھلا باپ کے پاس۔ اور بڑا اماں اور باپ دونوں کے زیر سایہ ان دونوں پلنگوں کے بیچ۔ مگر جب سے گھر میں چوہے بڑھ گئے ہیں اس بچے نے ٹرنک چڑھ کر اپنی خواب گاہ بنائی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی نہایت فراغت میں بسر ہو رہی ہے۔

مگر سوال تو یہ ہے کہ وہ حضرت جو ہمارے محبت سے کے ہندوستان تشریف لا رہے ہیں ان کا کیا بنے گا۔ ایک چارپائی کا تو خیر انتظام کر لیا ہے مگر اب کسی ماہر اقلیدس کی جستجو ہے جو کوئی ایسا زاویہ سمجھا سکے کہ یہ تیسری چارپائی بھی اس کمرے میں بچھ سکے۔ وہ حضرت سمجھ رہے ہوں گے کہ ہمارا تو خدا جانے کیا حال ہو گا۔ کیسے عالی شان محل میں رہتے ہوں گے۔ کیا ساز و سامان ہو گا وغیرہ

کہ خود ان کا نوکر اس لوٹ مار کا حال سُنکر یہاں بھاگ آیا تھا۔ اور آج کل وہ ایک اعلیٰ درجہ کی فیکٹری کا مالک ہے اور رہتا ہے اس شان سے کہ حضرت بھی دیکھیں گے تو دنگ رہ جائیں گے۔ اس کی کوٹھی کے ہر کمرے میں ایرانی قالین ہیں۔ پنکھے تو اس نے اتنے جمع کر لئے تھے کہ غسل خانے تک میں پنکھا ہے۔ اور ایک قالین تو اس کے پاس اتنا بڑا ہے جو کسی کمرے میں نہیں آتا بلکہ سہ پہر کو وہ باہر لان پر بچھا کر اپنی محفل گرم کیا کرتا ہے۔ آج وہ بھی ان حضرت کی آمد کی خبر سنکر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں میاں کو اپنے پاس ٹھہرانے کی کوشش کرونگا۔ خدا کرے وہ کوشش میں کامیاب ہو جائے ورنہ مجبوراً ان حضرت کو اناج کے گھڑوں کے قریب۔ گھڑونچی کے آس پاس چولھے کے متصل باورچی خانے ہی میں جگہ ملے گی۔ جہاں خدا کی ذات سے اُمید ہے کہ رات کو چوہے ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ اور صبح وہ اپنے نوکر کے گھر منتقل ہو جائیں گے۔ جس کا سازوسامان دیکھ کر ممکن ہے وہ خود ضبط کر جائیں۔ مگر ان کی نگاہیں ہم سے کہیں گی کہ ؎

اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اور واقعی وہ ہم سے نہ ہو سکا۔ جو اس نے اتنی دُور سے آکر اور اپنے کو مہاجر کہہ کر کیا۔ یا یہاں کے بہت سے مقامی مہاجر جو کئے ہوئے بیٹھے ہیں یہاں تو جو رفتار کا بیڈھنگا پن پہلے تھا وہ اب بھی ہے ویسے تو دل مطمئن رہا کرتا ہے مگر آج کچھ عجیب کیفیت ہے جس میں کچھ ندامت ہے کچھ پشیمانی ہے۔ ندامت ہے غیرت کی پشیمانی

سے لوٹ مار نہ کرنے کی اور ان سب کی آڑ میں وہ دیانتداری چھپی بیٹھی ہے جس کے ماتحت اس وقت ہم نے گھر نہ بھرا۔ جب گھر خالی کئے جا رہے تھے اور شرعی جواز یہ ڈھونڈھ لیا گیا تھا کہ اس لوٹ کے سامان کو لوگ مالِ غنیمت کہہ کر قبول کر رہے تھے۔ اور اسی مالِ غنیمت کے باعث ان کی حالت آج تک غنیمت بنی ہوئی ہے ہماری طرح نہیں کہ ایک دوست ذرا آ رہا ہے تو سٹپٹائے ہوئے ہیں کہ اس کو کہاں ٹھہرائیں گے عجیب عجیب ترکیبیں ذہن میں آ رہی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر غسل خانہ میں خالی کر کے صاف کر دیا جائے تو کروٹ لیکر ایک آدمی اس پر بھی سو سکتا ہے بہر حال جگہ دل میں چاہیئے جو بفضلہ موجود ہے بشرطیکہ آپ دل میں چارپائی بچھانے کی کوشش نہ کریں۔ بہر حال آنے دیجئے ان کو دیکھا جائے گا ۞

جگر کے مریض

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب شاعری کی دُنیا میں صرف ایک ڈنکہ بج رہا تھا۔ جگر۔ جگر مراد آبادی، جس کو دیکھئے جگر کے شعر گنگناتا۔ بلکہ کبھی کبھی چنگھاڑتا پھر رہا ہے۔ خود ہم نے ایک نہایت بد آواز تانگے والے کو ایک مرتبہ گاتے ہوئے سُنا۔ ع

ان مست انکھڑیوں کی قسم کھا کے پی گیا

اور ہم نغمہ کی اس ہولناکی کی تاب نہ لا کر جو تانگے سے جست کر کے بھاگے ہیں تو گھر آ کر دم لیا اور ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ دو تین ہفتہ تک ترنم کی خفیف سی خفیف لہر سے اختلاج ہونے لگتا تھا۔ ریڈیو المارہ ی میں مقفّل کر دیا تھا۔ مگر

قسمت تو بڑی ستم ظریف واقع ہوئی ہے۔ ہیں پوری کہ ایک مشاعرہ میں اچانک ایک صاحب سے تعارف کرایا گیا جن کو ہر طرف سے پریشانیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ مگر وہ خود نہایت مطمئن سے تھے۔ اُلجھے ہوئے بال۔ صرف سر ہی پہ نہیں چہرے پر بھی۔ گریبان چاک۔ اچکن پہنے ہوئے مگر اس طرح جیسے کوئی بدصورت عورت گلے پڑ جائے کہ طبیعت اس سے فرار چاہتی ہے مگر وہ دم کے ساتھ ہے۔ پان اس طرح کھائے ہوئے گویا خود ہی پان کھانے والے بھی ہیں۔ اور خود ہی پاندان بھی واقع ہوئے ہیں۔ ملانے والے صاحب نے فرمایا: "حضرت جگر مرادآبادی" اور ہم دھک سے رہ گئے۔ کہ منہ در منہ دنیا میں ایسا جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے۔ مگر اسی مشاعرے میں اسی وقت ان ہی حضرت نے غزل شروع کی جس کا ایک آدھ شعر آج تک ذہن میں موجود ہے۔

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں
جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا
کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھ لیں واعظ
میں اپنا ساغر اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

اور ہم نے دیکھا کہ غزل پڑھتے وقت یہی بدصورت آدمی۔ شاعر نہیں بلکہ شعر نظر آ رہا تھا۔ وہ حسن جو اس وقت اس شخصیت میں پیدا ہو گیا تھا دیکھا نہیں جا سکتا تھا محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اور ہم نے محسوس بھی کیا۔

اس مشاعرے سے واپس آنا تھا کہ اب جس مشاعرے میں جاتے ہیں ایک آدھ نوجوان ایسا ضرور نظر آجاتا ہے جو اسی قسم کے جھونٹے بکھرائے ہوئے۔ اسی طرح گریبان چاک، خواہ مخواہ بیٹھا جھوم رہا ہے۔ ان ہی کی طرح ہنس رہا ہے ان ہی کی طرح پان کھا رہا ہے اور ان ہی کی طرح کھوئے کھوئے انداز سے دانستہ اپنے کو گم کرنے کی عجیب عجیب بھونڈی کوششیں کر رہا ہے۔ فوراً سمجھ میں آگیا کہ اچھا یہ حضرت جگر بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا جگر یوں بنا جاتا ہے کہ اپنے کو خود اپنا کارٹون بنا کر رکھ دیا جائے۔ پڑھنے کی باری آئی تو وہی جگر کا طرز خواہ آواز کیسی ہی نامعقول کیوں نہ ہو وہی رندی اور سرمستی کا انداز، خواہ شراب تو درکنار کبھی افیون تک پینے کی توفیق نہ ہوئی ہو مگر جھوم جھوم کر اپنے کو بزعم خود جگر بنائے ہوئے دوسروں کے دل جگر آزما رہے ہیں بلکہ ایک آدھ سرپھرے نے تو واقعی یہ سمجھ لیا کہ جگر کا ایسا مقبول شاعر بننے کے لئے ضروری ہے کہ پی بھی جائے۔ ظرف کا سوال نہیں پینے سے غرض۔ پیدا ہوئے ہیں بھونڈی اور کوشش ہے شاعر بن جانے کی نتیجہ یہ کہ شاعر تو خیر ان کو نہ شراب بنا سکی نہ یہ بہروپیا پن البتہ مٹی ضرور خوار ہو کر رہ گئی۔ ایک دو نہیں سینکڑوں ایسے ہی مسخرے مشاعروں میں نظر آئے۔ اور پھر خدا جانے ان کا کیا حشر ہوا۔

یہ تو خیر انتہائی عقل کے بیتیموں کا ذکر ہے مگر ان کے علاوہ ایک قسم شاعروں کی وہ بھی تھی جس نے جگر سے صرف ایک آدھ پھبتیں اپنے اوڑھنے کے لئے اڑا لیں۔ مثلاً کسی نے ان کا محض ترنم چرانے کی کوشش کی۔ اور شاعروں میں سوائے جگر کی دھنوں کے اور کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ تھا جب جگر اپنے سینہ کے درد کی وجہ سے ایک ایسی دھن اختیار کئے ہوئے تھے۔ جس میں سانس کو بار بار ٹوٹنے کا موقع مل جاتا تھا۔ وہی دھن بہتیرے کتنے نوجوان شعرا نے اڑا لی۔ جگر میں کہ وہ دھن پر دھن بدل رہے ہیں اور ان کے بلاٹنگ پیپر ہیں کہ ہر دھن کو اپنے میں جذب کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ آواز نہ سہی وہ کیف نہ سہی۔ نہایت کھریا قسم کے خود واقع ہوئے ہیں۔ اور نہایت گھگیائی ہوئی آواز ہے مگر پڑھ رہے ہیں اسی دھن میں اس لئے کہ ان کے نزدیک جگر کی مقبولیت کا راز یہی آواز اور یہی دھن ہے بعض صاحبزادوں نے جو ذرا اڈل تک تعلیم یافتہ تھے ان کی بندشیں اپنانے کی کوششیں شروع کر دیں اب خواہ شعر کچھ بن جائے مگر وہ بندشیں ضرور آجائیں مثلاً جگر نے کہہ دیا ہے کہ:۔

اے ہجوم نا امیدی شاد باش و زندہ باش

تو وہ اس شاد باش و زندہ باش کو ضرور استعمال کریں گے۔ خواہ یہی کہیں کہ:۔

اے مری پیاری حماقت شاد باش و زندہ باش

جگر کی غزلوں پر غزلیں کہی جا رہی ہیں اُس نے جہاں کوئی زمین نکالی۔ بارہا
نے اس پر ہل چلانا شروع کر دیا۔ اور اس پر جو کچھ پیدا ہوا اس کو لگے چرنے۔
جگر جس شہر میں گئے اور ایک مشاعرہ بھی پڑھ آئے۔ بس وہاں جو بسوں کے
لئے گلی گلی جگر نظر آنے لگے۔ جس کو دیکھیئے وہ جگر کا بہروپیہ بنا پھر رہا ہے۔
شعر موزوں کرتے ہوں یا ناموزوں۔ بحر رمل ہو یا بحر الکامل۔ پڑھتے ہیں جگر
کی لے میں۔ اسی طرح جھوم جھوم کر جھونٹے بکھرا بکھرا کر۔ باچھوں سے پان
کی پیک بہا بہا کر مگر جگر تو خیر وہ کیا بنتے جو کچھ تھے وہ بھی نہ رہے اور ہمارا
تو خیال یہ ہے کہ جس تانگے والے کی بھیانک آواز سُن کر ہم بھاگ گئے تھے وہ
بھی جگر نہ بن سکنے والا شاعر ہی ہو گا جس کو آخر کچھ نہ بن سکنے کی وجہ سے تانگے
والا بننا پڑا۔ اور بھئی ایسا کہ سواریاں اس کی آواز سے بھاگیں۔ اور گھوڑا با
اڑیل ہو کر رہ جائے۔

جگر اپنی زندگی کے عجیب و غریب نشیب و فراز طے کر کے آخر
اس سطح پر نظر آئے جہاں وہ رئیس المتغزلین بھی تھے اور رندِ بادہ مست
نہیں بلکہ مردِ مسلمان۔ زندگی میں ایک باقاعدگی۔ عادات و اطوار کے
اعتبار سے مومن۔ جس کی لغزشیں اب تک خدا جانے کتنے نوجوانوں
کو گمراہ کر چکی تھیں۔ اب گیارہ سال سے ثبات کے ساتھ اپنی توبہ پر قائم

ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ۔

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پیئے جا رہا ہوں میں

دیکھنا یہ ہے کہ اب کتنے نوجوان جگر بننے کی کوشش کرتے ہیں کتنے شاعر مشاعروں میں ایسے نظر آتے ہیں جن کے کان صدائے اذان پہ لگے ہوئے ہوں۔ جو جگر کی طرح بہکنے اور لڑکھڑانے کے لئے تیار نظر آتے تھے۔ کیا وہ جگر کی طرح سنبھلنے اور راہ پہ آنے کی بھی کوشش کر سکتے ہیں جگر کی نقالی کا وقت اب آیا ہے۔ پہلے کی طرح اگر جگر لاہور آئے ہوتے تو ان کے جاتے ہی گوشہ گوشہ میں بیسیوں جگر ڈولے ہوئے نظر آتے۔ مگر اب جگر کو ایک دوسرے ہی عالم میں دیکھنے والے کاش جگر سے آج بھی کچھ حاصل کر سکیں۔ اس کی شاعرانہ حیثیت پہلے سے بھی بلند ہے۔ اس کے کلام میں آج پہلے سے کہیں زیادہ زمزمے ہیں۔ اس کو سنکر محفل آج بھی لہریں لیتی ہے۔ البتہ اب وہ ذرا نمازی ہے۔ بیشک اب وہ تائب ہے اب وہ بہکی بہکی باتیں نہیں بلکہ ذمہ دارانہ گفتگو کرتا ہے۔ اب اس کے مشاغل میں ذرا سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ دیکھنا ہے کہ ان خصوصیات کے شیدائی کتنے طالب علم ملتے ہیں اور جگر کے جانے کے بعد جگر کس حد تک لاہور میں رہ جاتے ہیں۔

شوکا نوٹ

شوکت صاحب نے یہ مضمون "مکتبہ عجیب غریب" کے پبلشر
کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔
اس سے پہلے بھی کئی ادیبوں نے (زیب داستان کے لئے)
پبلشروں پر اسی قسم کے مضامین لکھے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ
بعض ناشروں نے مصنفین کی حق تلفی کی ہو۔ لیکن ہر پبلشر
کے لئے، قارئین کے ذہن میں ایسی باتیں ثبت کرانا کچھ
مستحسن نہیں۔ اگر کچھ ناشر ایسے ہی مضامین کے مستحق ہیں
تو بہت سے مصنفین بھی تو اس سے بھی "جامع المضامین"

لکھے جا سکتے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ شوکت صاحب، کو آئندہ
ملاقات پر ایسے بہت سے واقعات بتاؤنگا ۔ شاید اس
طرح مضمون کی دوسری قسط بھی آپ تک پہنچ سکے ۔

محمد طفیل

اس کی شان کے قربان جائیے ۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے ۔

جیب میں ایک پیسہ نہ تھا اور گھر سے چلتے وقت گھر والی نے نوٹس دے دیا تھا کہ خرچ کا انتظام کرکے شام کو آنا ورنہ صبح اُٹھتے ہی دو دھ والے سے فوجداری ہوگی ۔ اس کے بعد دھوبی آجائے گا اپنا حساب کرنے اور اس ہفتہ کے راشن کا بھی کل ہی آخری دن ہے ۔ اگر راشن نہ آیا تو ایک ہفتہ تک خدا ہی حافظ ہے ۔ یہ تمام ضرورتیں اپنی پوری اہمیت کے ساتھ ذہن میں موجود تھیں مگر روپیہ آئے تو کہاں سے ۔ قرض کے تمام دروازے بند ۔ آمدنی کی تو خیر کوئی صورت ہی نہ تھی ۔ اب زیر غور مسئلہ یہ تھا کہ کسی کی جیب کاٹنا سب سے گیا اگر چوری ہی کرنا پڑی تو ذرا معزز قسم کی چوری کیوں نہ کی جائے ۔ مثلاً کسی تجوری کا قفل کیوں نہ توڑا جائے ۔ مگر ہمت ان دونوں میں سے کسی کام کی نہ تھی ۔ صبح سے دوپہر تک احباب کی فہرست پر کئی مرتبہ نظر ڈال چکے تھے ۔ جتنے چار پیسے والے دوست تھے ان سب سے قرض لئے بیٹھے تھے ۔ باقی

دوستوں کے متعلق یقین تھا اگر ان کے پاس گئے تو وہ صورت دیکھتے ہی خود ہم سے سوال کر بیٹھیں گے۔ آخر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ کوئی چیز بیچ ہی لیں۔ مگر اس تجویز پر عمل کرنا اس لئے آسان نہ تھا کہ اس وقت ہمارے پاس سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ قلم تھا جو لڑائی سے پہلے تو خیر ہم نے ڈھائی روپے میں خریدا تھا۔ مگر اب اس کی قیمت پانچ سے کم تو خیر کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ اور بات ہے پرانا ہونے کی وجہ سے کوئی ڈھائی روپے میں بھی نہ خریدے حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ نئے قلم میں وہ بات نہیں ہوتی جو چلتے ہوئے قلم میں ہوتی ہے۔ اور اس قلم سے ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ اب اس کے لئے صرف اشارے کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد صفحے کے صفحے وہ خود نہایت روانی سے لکھتا چلا جاتا تھا۔ مگر یہ وصف ہر ایک کو سمجھانا بھی کوئی آسان بات نہ تھی۔ ایسے سمجھدار لکھے پڑھے لوگ ضرورت کے وقت ذرا مشکل ہی سے ملا کرتے ہیں۔ قلم کے علاوہ جیب میں ایک چاقو بھی تھا۔ ہر چند اس چاقو کا دستہ ٹوٹا ہوا تھا مگر فولاد کا گیا گذرا تلوار کے لوہے کا بنا ہوا چاقو تھا۔ مگر اس کے دام بھی چند آنوں سے زیادہ ملنے کی امید نہ تھی کاش اس وقت جیب میں وہ گھڑی بندھی ہوتی جو پچھلے ہفتے داشتہ کے آخری دن دس روپے میں ہار دی تھی۔ اب اس کی یادگار اس کی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ یوں تو خیر یہ زنجیر پیتل کی تھی مگر کاریگر نے بنانے میں اپنا سارا فن صرف کیا تھا خیر اس

کے بھی آٹھ آنے رکھ لیجیے۔ اگر یہ سب چیزیں فروخت ہو سکیں تو بھی ساڑھے تین یا چار روپے سے زیادہ نہیں بنتے۔ حالانکہ ضرورت ہے کم سے کم دس بارہ روپے کی۔

ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ پردہ اُٹھا کر ایک صاحب نے فرمایا۔
"میں آسکتا ہوں ؟"

عرض کیا "تشریف لائیے "

وہ صاحب نہایت خاکسارانہ انداز سے کچھ مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ کر اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کا دل بہلانے لگا۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد پوچھا۔
"کیسے تشریف لائے ؟"

ان صاحب نے عجیب محبوبیت کے ساتھ فرمایا "آپ ہی کے پاس حاضر ہوا تھا میرا نام ہے اسلم اور میں مکتبۂ عجیب و غریب سے حاضر ہوا ہوں "

عرض کیا "مکتبۂ عجیب و غریب ؟ وہی نا جس نے حال ہی میں بڑے اہتمام سے ہارون کی سوانح عمری شائع کی ہے "

بڑے انکسار سے بولے " جی ہاں حیات ہارون ہماری تازہ پیشکش

ہے۔ اس کے علاوہ نقشِ چنگیز۔ ابلیس نامہ۔ سیاست جہنم اور افکارِ مشکر ہماری چند معیاری مطبوعات ہیں۔"

عرض کیا "صاحب آپ کا مکتبہ بڑی خدمت کر رہا ہے ادب کی اور یہ اعتماد ہے کہ جب تک اس قسم کے مکتبے اور دارالاشاعت ہمارے ادب کو مالا مال کر رہے ہیں ہمارا ادب زندہ رہے گا۔"

اسلم صاحب نے خوش ہو کر کہا "اس وقت حاضری کا مقصد یہ تھا کہ آپ بھی اپنی کوئی چیز ہم کو مرحمت فرمائیں۔"

عرض کیا "مجھ کو کیا عذر ہو سکتا ہے مگر تیار تو کوئی چیز نہیں ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں کوئی چیز جلد سے جلد آپ کے لئے تیار کر دوں۔"

اسلم صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سبز رنگ کا نوٹ نکالا اور بڑی عاجزی سے اپنے چہرے پر یتیمی برساتے ہوئے بولے۔ "یہ سو روپیہ علی الحساب اپنے پاس رکھیئے باقی معاملات کتاب تیار ہونے سے پہلے طے پا جائیں گے مگر ہم کو جلد سے جلد ایک ناول تیار کر دیجئے۔"

ہم نے سو روپے کا وہ نوٹ لے کر اس کی رسید اسلم صاحب کو دے دی اور وعدہ کر لیا کہ اسی مہینے کے اندر اندر مسودہ ان کو دیدیں گے۔

اسلم صاحب کو یقیناً خدا نے بھیجا تھا۔ رحمت کے فرشتے اسی طرح اچانک

آیا کرتے ہیں۔ اور یوں ہی نواز کر چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد دیر تک تو یہی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ بیداری ہے یا کچی خواب میں چھپر پھٹے نظر آئے ہیں۔ مگر جب دفتر کے اکاؤنٹنٹ سے اس نوٹ کے واقعی سو روپے گنوا کر وصول کر لئے اور دفتر سے دو گھنٹہ کی چھٹی لے کر سیدھے بازار پہنچے اور وہاں ضرورت کی چیزوں سے زیادہ غیر ضروری چیزیں خرید کر گھر آگئے تو یقین آ گیا کہ یہ خواب نہیں۔ بلکہ اس کارساز کی کارسازی ہے۔ راشن کیا یہاں تو جشن کا انتظام ہو گیا تھا۔ قرض خواہوں کے قرض ادا ہو گئے۔ کچھ کپڑا خرید لیا۔ اور جب بیوی نے فضول خرچی کا طعنہ دیا تو اس کو مطمئن کر دیا کہ یہ تو پیشگی رقم ہے اصل رقم تو اب آئے گی کتاب ختم ہونے کے بعد بلکہ اس اصل رقم کی امید پر کچھ تازہ مطالبات بھی بڑھا لئے۔

جب دل کو اطمینان ہو تو کام بھی خوب ہوتا ہے اور جب کام کے اختتام پر معقول معاوضہ ملنے والا ہو تو مزدور خوش دل دانی کند کار بیش، ناول ایک ہفتہ کے اندر ہی ختم کر کے رکھ دیا اس لئے کہ امید یہ تھی۔ کہ جو شخص معاملات طے ہونے سے پہلے یوں سو روپے کی رقم بغیر مانگے پیشگی دے وہ معاملات بھی ظاہر ہے کہ کس سیر چشمی سے طے کرے گا۔ اور وہ رقم کتنی بڑی ہو گی جو معاملات طے ہونے کے بعد ملے گی جس رات ناول مکمل کیا ہے اس رات نیند تو خیر کیا آتی البتہ فہرست بناتے رہے کہ دفتر سے واپسی پر بازار سے کیا کیا چیزیں لانی ہیں

اس فہرست میں بچوں کے کچھ کپڑے اور کھلونے تھے۔ اپنے لئے موزے اور بنیائن۔ بیوی کے لئے ایک ذرا اچھے قسم کی ساڑی۔ ایک ذرا قیمتی سا قلم۔ دھوپ کا چشمہ۔ مچھر مارنے کا تیل۔ شربت کی بوتل۔ اور نہ جانے کیا کیا۔

صبح جب دفتر جانے لگے تو راستہ میں سائیکلوں کی دکان پر ٹھہر کر احتیاطاً سائیکلوں کی قیمت بھی دریافت کر لی۔ کہ آجکل کیا بھاؤ ہے۔ آگے بڑھے تو خدا جانے بیوی کی یاد نے کیوں ستایا۔ ایک دکان پہ پہنچ کر سونے کا بھاؤ پوچھ لیا۔ بلکہ دکاندار سے ایک بندے کی جوڑی کے متعلق کہہ دیا کہ اس کو اٹھا کر الگ رکھ دو۔ واپسی میں سودا ہوگا۔ اس دکان سے نکلے ہی تھے کہ اصغر اور حمید مل گئے۔ ان سے کہدیا کہ بھئی اس وقت تو ذرا جلدی سے دفتر پہنچنا ہے کل شام کو گھر آؤ تو ذرا تفصیلی باتیں ہوں گی اور کھانا ساتھ ہی کھانا۔ ان سے رخصت ہو کر دفتر پہنچے۔ اور سب سے پہلے مکتبہ عجیب و غریب کا نمبر ملا کر اسلم صاحب سے کہا کہ وہ فوراً آجائیں۔

اسلم صاحب تھوڑی ہی دیر میں حسب معمول یتیم بنے ہوئے تشریف لے آئے اور ہم نے ناول کا مسودہ ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "اب معاملات طے کر لیجئے۔"

اسلم صاحب نے مسودے کو الٹ پلٹ کر اور سطروں کو گن کر کچھ حساب لگایا۔

کچھ مسکرائے کچھ بڑبڑائے اور آخر اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سُرخ رنگ کے کچھ نوٹ نکال کر ہم کو دیتے ہوئے کہا" سو روپے تو پہلے پیش کر چکا ہوں بقیہ پچاس روپے یہ حاضر ہیں۔ جملہ حقوق کی رسید لکھ دیجئے"

حیرت سے عرض کیا" کیا مطلب؟ گویا کل ڈیڑھ سو روپے"

اسلم صاحب نے بڑے اطمینان سے فرمایا" جی ہاں یہ رقم بالکل ٹھیک ہے ہماری شرح یہی ہے"

ہم نے وہ روپے واپس کرتے ہوئے کہا" یہ آپ آخر کیا کہہ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو روپے میں کہیں کتاب دی جاتی ہے۔ مجھ کو یہ سودا ہرگز منظور نہیں"!

اسلم صاحب نے اپنے مختلف مصنفوں کے حوالے دیتے ہوئے کہا" اس سے زیادہ تو مکتبہ شاید اور کچھ نہ پیش کر سکے"

ہم نے کہا" تو پھر جانے دیجئے"

اسلم صاحب نے مجبوراً کہا" بہر حال جو مرضی ہو آپ کی" ہم تو چاہتے تھے کہ معاملہ ہو جاتا۔ آپ اگر نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ وہ سو روپے واپس کر دیجئے"

وہ سو روپے؟ اب سمجھ میں آیا کہ وہ سو روپے کیوں پیشگی دیئے گئے تھے۔ اور اب معلوم ہوا کہ یہ تاجر پبلشر دکھتی رگ کو کس صفائی سے ٹٹول لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب وہ سو روپے واپس نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اور

چونکہ وہ واپس نہ ہو سکتے تھے لہٰذا ہم مجبور تھے کہ یہ سودا ان ہی داموں کریں۔ ان سو روپوں کے علاوہ ان پچاس کی بھی ضرورت اب یوں تھی کہ اصغر اور حمید کل کھانے پہ آ رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارا ہاتھ بڑھا۔ یہ نوٹ ہماری جیب میں اور مسودہ اسلم صاحب کی جیب میں پہنچ گیا۔ اور جملہ حقوق مکتبۂ عجیب و غریب کے نام لکھ دیئے گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

سسرالی رشتہ دار

مصیبت یہ ہے کہ ریڈیوسٹ سسرال میں بھی ہے۔ اور وہاں کی ہر دیوار گوش دارد۔ اگر بزرگوں کا یہ مقولہ اس وقت رہ رہ کر اُکسا رہا ہے کہ بیٹا پھانسی کے تختہ پر بھی سچ بولنا، خواہ وہ پھانسی زندگی بھر کی کیوں نہ ہو۔ موضوع جس قدر نازک ہے اسی قدر اخلاقی جرأت چاہتا ہے اور اس اخلاقی جرأت کا نتیجہ بھی معلوم، کہ سسرال کی آنکھوں کا تارا۔ خوشدامن صاحبہ کا راج دلارا اس تقریب کے بعد پھر شاید ہی سسرال میں منہ دکھانے کے قابل رہ جائے۔ ہر چند کہ حفظ ما تقدم کے طور پر آج سسرال والوں کو سینما کے پاس لا کر بھی دے دیئے ہیں اور ریڈیوسٹ کا ایک بلب بھی احتیاطاً جیب میں ڈال لائے

ہیں گے۔ یہ سب کچھ سسرال کے صرف ایک گھر میں ہُوا ہے اور گھر ٹھہرے وہاں درجنوں ظاہر ہے کہ کوئی نہ کوئی تو یہ تقریر سُن ہی لے گا اور پھر سسرالی ٹرانسمیٹر سے نمک مرچ لگا کر یہ تقریر نشر ہو گی۔ بیوی کا مُنہ پھول جائے گا۔ ان کی والدہ کی سرد آہیں محلہ بھر کو فریجیڈیر بنا کر رکھ دیں گی، ان کی خالہ گردن ہلا ہلا کر اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر فرمائیں گی کہ میں نہ کہتی تھی داماد آستین کا سانپ ہوتا ہے۔ آخر کب تک نہ پھنکارتا۔ سارا کیا دھرا ملیا میٹ کر کے رکھ دیا کہ نہیں مگر اب تو جو کچھ ہو سچ تو بولنا ہی پڑے گا۔ ان لوگوں کا یہاں ذکر نہیں جو سسرال میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ بلکہ مخاطب وہ ہیں جن کو ابھی داخلِ بہ سسرال ہونا ہے کہ ؎

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ عقد وقد ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
مجھ سے وصول کر لو نصیحت جو نقد ہے

کہ میں ایک داماد ہوں اور میں نے جلد بازی سے کام لے کر شادی کے معاملہ میں صرف بیوی کے سلسلے میں تو ضروری تحقیقات کر لی تھی کہ عمر کیا ہے، صحت کیسی ہے۔ صورت شکل کا کیا عالم ہے۔ تعلیمی استعداد کیا ہے وغیرہ وغیرہ مگر اب اکثر سر پہ ہاتھ رکھ کر رونا پڑتا ہے۔ کہ یہ کیوں پوچھا تھا کہ ان

کی کتنی خالائیں کتنی نانیاں۔ دادیاں۔ پھپھیاں۔ تائیاں۔ بہنیں اور بھاوجیں ہیں۔ اور کتنے اسی قسم کے مرد رشتہ دار ہیں۔ اور ان رشتہ داروں کے کتنے ایسے رشتہ دار ہیں جن کو جبراً اپنا رشتہ دار سمجھنا پڑے گا اور کتنے ایسے عزیز ہیں جن کو اخلاقاً عزیز ماننا پڑے گا۔ پھر ان کے بعد ان عزیزوں کی باری آتی ہے جن کو انتظاماً عزیز کہا جاتا ہے۔ پھر انتقاماً عزیز بن جانے والوں کی باری آتی ہے۔ اور آخیر میں جغرافیائی رشتہ دار آتے ہیں مثلاً خالہ ہمسائی۔ اور چچا پڑوسی وغیرہ، اس تحقیقات نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب۔ ؎

دلِ غریب اِدھر ہے اُدھر زمانہ ہے

ایک سے ایک سسرالی رشتہ دار روز دیکھیے جو محبت چھڑکنے دھرا ہوا ہے غریب خانے پر دفتر سے تھکے ہارے بھوکے۔ پیاسے دماغ کا عرق نکلوائے ہوئے سکون کی تلاش میں گھر پہنچے ہیں۔ کہ دیکھتے کیا ہیں، میٹھے پانی کی بوتلیں بھقا بھق کھل رہی ہیں، مُرغ ذبح ہو رہا ہے خانساماں باورچی خانہ میں پتیلیوں سے ورزش کر رہا ہے اور اندر سے ایسے قہقہوں کی آوازیں آرہی ہیں گویا کوئی بے چارہ آسیبی خلل میں مبتلا ہے کسی ملازم سے پوچھا کہ یہ گھر کس کے نام الاٹ ہو گیا۔ معلوم ہوا بیگم صاحبہ کے کوئی پھوپھا...... معہ اہل وعیال تشریف لائے ہیں۔ جل تُو جلال تُو...... صاحب کمال تُو...... آئی بلا کو ٹال تُو...... کا وظیفہ پڑھتے گھر میں جو داخل ہوئے تو بیگم صاحبہ

خوشی سے بدحواس وہ ڈری ہوئی تشریف لائیں۔ اے آپ کو خبر بھی ہے کون آیا ہے۔ پھوپھا میاں۔ پھوپھی۔ بجو۔ جگنو۔ چمپی۔ لاڈو۔ رانی۔ آئیے نا آپ نے تو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ان سب کو۔ بڑا انتظار کر رہے ہیں سب آپ کا۔ عرض کیا۔ کچھ بتائیے تو سہی یہ کون سے پھوپھا تصنیف کر لئے آج بیٹھے بٹھائے وہ جو پچھلے دنوں آئے تھے۔ وہ بھی تو پھوپھا تھے احمق سمجھ کر مسکرائیں۔ بلکہ وہ تو ذرا دور کے پھوپھا تھے۔ یہ ان سے ذرا قریب کے پھوپھا ہیں۔

ابا جان کی رشتہ میں خالہ زاد بہن کی سگی نند ہیں۔ یہ تو ہماری شادی میں بھی نہ آسکی تھیں۔ پھوپھا میاں بیچارے پر ایک جھوٹا مقدمہ چل گیا تھا ان دنوں، مطلب یہ کہ اب آئے ہیں یہ لوگ۔ بڑی محبت کے لوگ ہیں آپ بہت خوش ہوں گے چلئے میں چائے لگواتی ہوں سب کے ساتھ آپ بھی پی لیجئے گا اب جو ہم ان ذرا قریب پھوپھا کے پاس پہنچے تو جی چاہا کہ ان سے مزاج پوچھنے کے بجائے گھی کا بھاؤ پوچھ لیں۔ چڑھی ہوئی داڑھی۔ بڑا سا گچھا۔ خوفناک آنکھیں، پہاڑ کا پہاڑ انسان ہماری شادی کے زمانے میں اس شخص پر جھوٹا نہیں بلکہ ڈکیتی کا سچا مقدمہ چل رہا ہوگا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی ڈر کے مارے عرض کیا۔ السلام علیکم۔ وہ حضرت ایکدم سے وعلیکم السلام کا بم رسید کر کے حملہ آور ہوگئے اور اس زور سے مصافحہ فرمایا ہے کہ بھتیجی کا سہاگ ٹمٹا کر رہ گیا۔ ابھی ان حضرت سے زور کر ہی رہے تھے کہ ان

کی اہلیہ محترمہ بلائیں لینے کو جو آگے بڑھیں ہیں تو بیساختہ کلمۂ شہادت زبان پہ آگیا کہ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہے کہ مرنے سے پہلے کلمہ پڑھ سکے آدمی۔ مگر یہ محترمہ تعیں۔ کہے از خوشدامن دعائیں دیتی ہوئی ہٹ گئیں۔ اب جو نظر پڑتی ہے تو ان کے ایک صاحبزادے ہمارا ٹینس کا بلّا لئے ایک سڈول قسم کے پتھر سے کھیل رہے ہیں اور ہم پہ وہ وقت پڑا ہے کہ ہم ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہ بلّا ہے جس سے ہم کو آل انڈیا ٹینس چیمپئن شپ کے میچ کھیلنا ہیں۔ ٹینس کے اس بلّے پر فاتحہ پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک نہایت گھناؤنی سی صاحبزادی ایک اس ہاتھ میں اور ایک اُس ہاتھ میں دو پیپر ویٹ لئے ہوئے نظر آئیں جو ظاہر ہے کہ لکھنے کی میز سے اُٹھائے گئے ہوں گے لپک کر لکھنے کی میز کو جو دیکھتے ہیں۔ تو وہاں روشنائی کا سیلاب آچکا ہے۔ اور اکثر ضروری کاغذات روشنائی میں ڈوب کر خشک بھی ہو چکے تھے۔ ابھی رونے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ڈریسنگ ٹیبل پہ زلزلہ سا آگیا۔ چھوٹی بڑی شیشیاں آپس میں ٹکرانے لگیں اور ایک آدھ گر بھی گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ایک برخوردار اس کے نیچے سے برآمد ہو رہے ہیں۔ جی چاہا کہ سر پیٹ لیں۔ مگر بیگم نے باہر ہی سے آواز دی کہ چائے لگ گئی ہے۔ لہذا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے چائے کی اُس میز پہ آگئے جو مہاجرین کا کیمپ بنی ہوئی تھی۔ پھوپھا صاحب چائے کی پیالی سے طشتری میں چائے

اِنڈیل انڈیل کر شڑپ شڑپ کی آوازوں کے ساتھ چائے نوش فرما رہے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ کیلا کھا چکنے کے بعد ایک ایک کیلا اپنی اولاد کو تقسیم فرما رہی تھیں۔ اور اولاد خشک میوے سے اپنی جیبیں بھر رہی تھی ایک صاحبزادے نے اپنی بہن سے بادام چھیننے کی کوشش میں جو ہاتھ مارا ہے تو نئے سٹ کی کیتلی ایک زمزمے کے ساتھ فرش پر رگڑ کر چکنا چور ہو گئی تو ہم نے اپنے کو غشی سے بچاتے ہوئے عرض کیا کوئی مضائقہ نہیں۔ حالانکہ یہ سو فیصدی مضائقہ ہی مضائقہ تھا۔ پھوپھا صاحب نے اِدھر سے اور پھر پھوپھی صاحبہ نے اُدھر سے صاحبزادے کو دو ہاتھ رسید کر کے رہی سہی فضا کو اور بھی نغموں سے لبریز کر دیا۔ اور اب جو اُن برخوردار نے رونا شروع کیا ہے تو خودکشی کو جی چاہنے لگا۔ خدا خدا کر کے یہ طوفان تھما تو پھوپھا صاحب نے تقریب تشریف آوری کچھ اس فصاحت سے بیان فرمائی ہے کہ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ معلوم ہوا کہ مقدمہ چل جانے کی وجہ سے ملازمت جاتی رہی ہے۔ لہٰذا اب آپ ملازم ہونے تشریف لائے ہیں۔ اور جب تک یہ خاکسار ان کے لئے ملازمت کا انتظام نہیں کرتا وہ ٹلنے والے نہیں ہیں۔ عمر پنشن لینے کے لگ بھگ تعلیم ایسی کہ خواندہ کانسٹیبل بھرتی ہو کر ہیڈ کانسٹیبل کے عہدہ جلیلہ تک ترقی فرمائی تھی کہ اب یہ پکڑتے ہی چھوڑنے والی رشوت پکڑ لی گئی اور۔۔۔

دھوے گئے دل خانہ خراب کے بدلے

وہ تو کہیئے خوش نصیب تھے کہ قالین بافی سیکھنے جیل نہیں بھیجا گیا صرف ملازمت ہی گئی۔ خیر یہ تو جو کچھ ہوا وہ ہوا سوال تو یہ تھا کہ آخر ہم اپنی کس جیب سے ملازمت نکال کر ان کے حوالے کرتے کہ اے ہماری بیوی کے محترم پھوپھا یہ لے ملازمت۔ ہم کو خاموش دیکھ کر بولے "برخوردار اس خاموشی سے کام نہ چلے گا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم کس قدر اثر اور رسوخ کے آدمی ہو۔ ذرا سا اشارہ کر دوگے تو اچھی سے اچھی ملازمتیں میرے لئے خود ہاتھ پھیلائیں گی۔ صاحبزادے حکام رسی بڑی چیز ہوتی ہے۔ اور میں تو اس کو اپنے خاندان کے لئے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں۔ کہ تمہارا ایسا بارسوخ برخوردار ہمارے خاندان میں شامل ہو گیا ہے تو میاں مطلب یہ ہے کہ میرے گھر کا خرچ ڈھائی سو روپیہ ماہوار سے کسی طرح کم نہیں ہے میں یہ چاہتا ہوں۔ کہ ملازمت ایسی ملے کہ بالائی آمدنی کی لعنت میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ بیگم صاحبہ نے بڑی شگفتگی سے فرمایا "پھوپھا میاں بس اب آپ اطمینان رکھیئے آپ نے ان سے کہہ دیا ہے بس اب یہ سمجھ لیجئے کہ نوکری مل گئی۔ ان کی کوشش ٹل نہیں سکتی۔ اور ہم کو گھور کر چٹپٹا ہنسنے کا اشارہ کر دیا۔ لہٰذا ہم کو کہنا ہی پڑا کہ "انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔

چائے کے بعد ہم نے اپنے کمرے میں آکر بیوی صاحبہ کو بلا کر سچ مچ رو دینے کے انداز سے کہا: "خدا کے لیے یہ تو بتاؤ کہ تم نے آخر میرا انجام کیا تجویز کر رکھا ہے۔ یہ تمام نقصانات۔ یہ سب ابتری گھر کی۔ یہ ستیاناسی میرے کمرے کی۔ میرے قیمتی رکیٹ کی یہ بربادی۔ وغیرہ تو ایک طرف ہیں ان سب نقصانات کو اپنی جان کا صدقہ سمجھ لیتا مگر مجھ سے آخر ایسے وعدے کیوں کرا دیتی ہو جو میرے امکان ہی میں نہ ہوں۔ بھلا غور تو کرو میں ان حضرت کو ڈھائی سو روپیہ ماہوار کی ملازمت کیسے دلوا سکتا ہوں۔" سرگوشی کے انداز میں بولیں آپ سچ مچ عقل کے دشمن ہیں۔ میں نے تو اپنے میکے میں آپ کا نام اونچا کرنے کے لیے مشہور کر رکھا ہے۔ کہ آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ بڑے بڑے افسر آپ کے نام کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم اس طرح عزت بڑھتی ہے آدمی کی۔ ایک آدھ دن کے بعد خوبصورتی سے ٹال دوں گی۔ عرض کیا کاش یہ خوبصورتی آپ اب آزمائیں تاکہ میرا قیمتی رکیٹ بچ جاتا۔ اتنے حسین چائے کے سٹ کی کیتلی نہ ٹوٹتی۔ "پھر رازداری سے بولیں: "ارے آپ کو نہیں معلوم ہے یہ پھوپھا بڑے ڈھنڈورچی ہیں۔ اگر یہاں سے ہم لوگوں کے حسنِ سلوک کے قائل ہو کر گئے تو سارے خاندان میں آپ کی تعریفیں کرتے پھریں گے۔ آج ان صاحب کو سنیما ضرور دکھا دیجئے۔ کسی کا موٹر چپکے سے منگوا لیجئے گا۔ میں نے کہہ رکھا

ہے کہ موٹر کا رخانے گیا ہوا ہے"۔ یعنی یک نہ شد دو شد آپ نے یہ بھی مشہور کر رکھا ہے کہ گھر کا موٹر بھی ہے۔ اب بتائیے اس میں بیچارے سسرال والوں کا کیا قصور وہ تو اسی قسم کی موٹی تازی توقعات لے کر آتے ہی رہیں گے اور بیگم صاحبہ کی یہ شیخی دیوالہ نکلوا ئی رہے گی۔ اسی طرح بات یہ ہے کہ اس بات کا صحیح اندازہ تو مردم شماری کے کاغذات کو دیکھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ کہ بیگم صاحبہ کی معرفت ہمارے سسرالی عزیزوں کے صحیح اعداد و شمار کیا ہیں۔ مگر فی الحال تو یہ ہو رہا ہے کہ دفتر میں بیٹھے کہ چلمن اٹھائی اور کوئی نہ کوئی اجنبی بزرگ موجود۔ برخوردار تم مجھ کو نہیں جانتے مگر تم دراصل میری آنکھوں کے نور اور دل کے سرور ہو اور میں رشتہ میں تمہارا خسر ہوتا ہوں وہ بچی جو تم سے منسوب ہے میری گودوں کی کھلائی ہوئی ہے اور میں بچپن ہی سے اس کی پیشانی پر وہ ستارہ چمکتا ہوا دیکھ رہا تھا جس کو نیر اقبال کہتے ہیں۔ تو عزیز من دیکھنے کو بے حد جی چاہتا تھا۔ دوسرا کام یہ تھا کہ میرے بچے یعنی تمہارے برادر نسبتی کا چالان ہو گیا ہے۔ جوے کے سلسلے میں غالباً صاحبزادے نے کسی کا سر پھاڑ دیا ہے بہرحال تم میرا اتنا کام کر دو کہ اس چالان کے قصے سے نجات دلوا دو کسی طرح اب وہ کام ہو سکتا ہو یا نہ ہو سکتا ہو مگر اس حماقت کی پاداش میں کرنا ہی پڑیگا کہ ان کے خاندان میں شادی کر بیٹھے ہیں۔ دفتر سے گھر پہنچے ہیں تو کوئی اور ہی رشتہ دار موجود ہے

اپنی کسی ایسی ہی غرض کو لئے ہوئے۔ اور اگر کچھ بھی نہ سہی تو آج اس سسرالی عزیز کے کسی عزیز کی شادی ہے اور دلہن کے لئے تحفہ کی ضرورت ہے۔ آج اس سسرالی عزیز کے بندہ زادے کا عقیقہ ہے اس میں شرکت کی ضرورت ہے۔ اور شرکت ٹیکس کی بھی۔ بیگم صاحبہ واقع ہوئی ہیں ایسی مرنجاں مرنج کہ میکوں والوں سے تعلقات بھی زیادہ سے زیادہ استوار رکھنا چاہتی ہیں اور شوہر کو بھی کچھ ایسا رائی کا سا پہاڑ بنا کر اپنے میکے بھر میں مشہور کر رکھا ہے کہ ان کی تصنیف کی ہوئی پوزیشن کو سنبھالنا ایک مستقل عذاب بن کر رہ گیا ہے حال یہ ہے کہ کسی پر مقدمہ چل جائے وہ دوڑا آئے گا۔ اس خاکسار کے پاس۔ کسی کو کوئی سفارش پہنچانا ہو گی منہ اٹھائے چلے آئیں گے غریب خانے پر۔ کسی سے کوئی جرم سرزد ہو گا پناہ لی جائے گی اس خاکسار کی آڑ میں۔ بیوی نے اس خاکسار شوہر کو تبرک بنا کر اپنے میکے میں بانٹ دینے کی ٹھان لی ہے۔ اور خوش ہیں کہ میاں کا سکہ جم رہا ہے میرے عزیزوں میں۔ میاں ایسے حواس باختہ ہو چکے ہیں کہ ——— ان سسرالی نوازشات کا اب سلسلہ بند ہوتا ہی نہیں ہے کوئی لاکھ محبت چھڑکتا۔ خلوص برساتا۔ مامتائیں لٹاتا ہوا آئے مگر یہ سنتے ہی خون خشک ہو جاتا ہے کہ یہ سسرالی عزیز ہے۔ وہ بے چارہ داماد پرسی

کا احسان کرتا ہے اور داماد اپنے سسرال سے بیزار ہوتے جا رہے ہیں کہ وہ یہی کہتے ہیں کہ ؎

مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا

میں میراجی کو نہیں جانتا

واقعی میں میراجی کو بالکل نہیں جانتا۔ اور جانتا بھی کیسے وہ زندگی بھر بھوت بن کر جیے اور مرنے کے بعد زندہ ہو رہے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ان کے انتقال کے بعد مجھ کو ان کی خدمت میں کچھ کچھ نیاز حاصل ہو رہا ہے تو غلط نہ ہوگا اور عافیت بھی اسی میں ہے کہ ایسے لوگوں سے مرنے کے بعد ملا جائے ورنہ وہ تو ملنے والے کے لئے مستقل عذاب بن سکتے ہیں۔ میں اب میراجی کے متعلق جتنا جتنا پڑھتا جاتا ہوں اتنا ہی اپنے کو خوش قسمت سمجھتا جاتا ہوں کہ میں اُن سے نہیں ملا تھا۔ ورنہ ایک ایسے شخص سے کیونکر نباہ کر سکتا تھا جس کی زندگی کچھ عجیب گنجھوروں کی سی تھی

کہ اب بھی اُن کو تصور میں لاتے ہی تمام جسم میں کچھ گھِن سی پیدا ہو جاتی ہے ۔ جب میں میراجی کے متعلق اپنے منتشر تصورات کو یکجا کرتا ہوں تو میرے سامنے ایک اونٹ کی سی شکل بن جاتی ہے جس سے میں حیرت سکے سامنے پوچھتا ہوں اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی ۔ ان کو اُردو سے عشق تھا لہذا انگریزی فلمیں دیکھتے تھے ۔ اور چونکہ وہ انگریزی فلمیں دیکھتے تھے لہذا ایک بنگالن کے عاشق تھے ۔ شعری اصطلاح میں اس صنعت کو شتر گربہ کہتے ہیں اور اگر شعری اصطلاح سے کام نہ لیا جائے تو اس کا نام اونٹ بکری اگرہ ہے ۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت پر ایمان نہ لانا میرے مذہب میں کفر ہے اور خواہ باقی تمام شاعر مجھ پر ہتک کا دعویٰ کر دیں مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میراجی جتنے بڑے شاعر تھے اگر اتنا ہی چھوٹا اُن کا ماحول نہ ہوتا تو وہ اور بھی بڑے ثابت ہوتے ۔ مگر شاعری کے علاوہ جب ان کے دوسرے حالات پہ غور کرتا ہوں تو بس غور کرتا ہی رہ جاتا ہوں بلکہ اکثر تو معلوم نہیں کیوں توبہ کرنے لگتا ہوں ۔

میراجی کو میں نے ان کے بعض مقرب دوستوں کے ذریعے ان کے مرنے کے بعد جانا ۔ ان دوستوں میں بڑے بڑے معقول لوگ تھے ۔ مثلاً ن ۔ م ۔ راشد ۔ محمود نظامی اور اخلاق دہلوی وغیرہ ۔ اخلاق بیچارے تو خیر

کسی کو کبھی بُرا کہنے ہی نہیں ان کا نام ان کی فطرت ہیں کہ اُن پر چھا گیا ہے مگر یہ ن۔م۔ راشد اور محمود نظامی تو بڑے مُنہ پھٹ لوگوں میں سے ہیں ایسی قسم کے لوسے حلقہ اربابِ ذوق ہیں کہ مُنہ در مُنہ ایسی تنقید کرتے ہیں کہ آدمی جھینپ کر رہ جائے مگر ان لوگوں کو بھی میں نے اُس وقت میراجی کا مداح پایا ہے جب ان کو نہ آملیٹ بننے کا خطرہ تھا نہ میراجی کے ٹوٹتے ہوئے دل کے کچھ اور ٹوٹنے کا۔ زندگی بھر میراجی کو اگر کسی خطرے کی وجہ سے بُرا نہ کہہ سکے تھے تو مرنے کے بعد تو کہہ ہی سکتے تھے کہ خس کم جہاں پاک مگر میں نے ان کو بھی میراجی کے انتقال پر کچھ اس قسم کا سوگوار سا پایا جو ایک ہی داؤں پہ ساری پونجی لگا کر ہار گیا ہو۔ میراجی کو وہ عجیب الخلقت کہتے تھے مگر پھر بھی پیار کرتے تھے۔ میراجی ان کو آملیٹ بنا چکے تھے مگر وہ پھر بھی میراجی کے لئے اشکبار تھے اور میراجی کے جس وجود سے اُن کو اُکتا جانا چاہیئے تھا اُسی کی کمی ان کے لئے ایک ایسا خلا پیدا کئے ہوئے تھی جس کو کبھی پُر نہ کیا جا سکے۔

میں نے جب سب سے پہلی مرتبہ میراجی کی تصویر دیکھی تو مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی اور اب تک سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ بجائے غصہ آنے کے یہ ہنسی کیوں آئی تھی اور میں غور کرتا ہوں کہ اگر بجائے تصویر کے میں

خدانخواستہ خود میراجی کو دیکھتا تو کیا اسی بدتمیزی کے ساتھ ان کو دیکھتے ہی ہنس دیتا۔ صاحبان کوئی تعجب نہیں کہ میں واقعی ہنس دیتا۔ بھلا غور تو کیجئے مجھ سے ان کے گلے میں پڑی ہوئی وہ مالائیں کیسے دیکھی جاتیں۔ ان کے وہ لمبے لمبے بال کیسے دیکھتا اور اُن کی وہ مکمل شخصیت مجھ سے کیسے برداشت ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ پھر وہ حضرت میرا بھی آملیٹ بناتے۔ یہ آملیٹ بنانے کی ترکیب ان کے مقربین ہی سے مجھ کو معلوم ہوئی ہے کہ میراجی جس سے ناراض ہو جاتے تھے اُس کو کسی نہ کسی طرح گھیر کر کسی محفلِ ساقی میں لے جاتے تھے اور پھر پینے کے بعد نہایت خلوص کے ساتھ اُس کی مرمت شروع کرتے تھے اور رفتہ رفتہ یہ خلوص "تشدد" اختیار کر کے انتقام بن جاتا تھا اور اُس بیچارے کی وہ گت بنتی تھی کہ جسم بھر میں ضرباتِ شدید و ضرباتِ خفیف کا ایک جال سا پیدا ہو جاتا تھا۔ کہیں گومڑے پڑے ہوئے ہیں تو کہیں نیل۔ کہیں جلد پھٹ کر خون بہہ رہا ہے تو کہیں ہڈی کی چوٹ آئی ہے مختصر یہ کہ مضروب کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی بلوے سے جان بچا کر تو آگیا ہے مگر جسم اُس کی سخت جانی کا گواہ ہے۔ اس کے بعد میراجی خود ہی اسکی تیمارداری فرماتے تھے اور ہومیوپیتھک طریقہ پر علاج کرتے۔

کچھ بھی سہی مگر مجھے یقین ہے کہ میرا آملیٹ ان کے ہاتھوں ضرور بنتا

ہیں ان کے ہاتھ میں مداریوں والے لوہے کے گولے دیکھ کر کیونکر ضبط کر سکتا تھا۔ میں ان کو اپنی مالا پہ میرا بیرا جپتے ہوئے اور سادھوؤں کی طرح گیانی دھیان میں بیٹھا ہوا دیکھ کر کیونکر چپ رہ سکتا تھا۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایسا عجیب الخلقت انسان گرمیوں میں جاڑے کے کپڑے پہنے ہوئے ہاتھ میں مداریوں کے گولے لئے۔ گلے میں موٹے موٹے دانوں کی مالائیں ڈالے۔ لمبے لمبے بال الجھائے بیٹھا ہوا میرابائی کے بھجن گایا کرتا اور میں اتنا بیوقوف ہو جاتا کہ ہنستا بھی نہیں۔ یہ میرے لئے ناممکن تھا اور چونکہ میں اس قسم کے موقعوں پہ ضبط نہ کر سکتا لہٰذا میرا آطیٹ بننا برحق تھا۔ وہ تو کہئے خیریت گزری کہ میں اُن سے ملا ہی نہیں۔

وہ شخص جو ثناء اللہ بن کر پیدا ہوا اور میرا جی بن کر مرا۔ وہ مسلمان جو HINDU MYTHOLOGY کا دیوانہ تھا۔ وہ شاعر جس کو مذہبیات جنسیات اور نفسیات کے مطالعہ کا جنون تھا۔ وہ کنوارا جو میرا سین پہ مر کر زندہ رہا اور پھر دلی میں باؤلی بیگم اور للی خانم کے عشق کا دم بھرتا رہا مگر کبھی کا شرمندۂ احسان نہ ہوا۔ وہ شرابی جس کو خود شراب پیئے جا رہی تھی۔ وہ وجدانی جو تخلیہ میں قرآن پاک سنکر روتا اور دم تحریر بغیر دیوتا گرنی میں ادھم مچے ہوئے کچھ نہ لکھ سکتا۔ ذرا غور تو کیجئے میرا جی کی سمجھ

ہیں کیونکہ آ سکتا تھا۔ اس قسم کی شخصیتیں سمجھنے سمجھانے کے لئے ہوتی ہی کب ہیں ان پر غور کیجئے تو عقل کا زیاں خود نہ کیجئے تو ذہنی فالج کا خطرہ۔

مجھ کو میرا جی کی طرف کھینچنے میں اخلاق کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ یہی اخلاق ہیں جن کے نام میرا جی نے اپنے گیتوں کا مجموعہ گیت ہی گیت منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے " اخلاق احمد کے نام جسے ان گیتوں کے ماخذ معلوم ہیں" شروع شروع میں اخلاق اس کثرت سے میرا جی کا ذکر خواہ مخواہ کیا کرتے تھے کہ بعض اوقات میں اُلجھ جایا کرتا تھا اور کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ ان حضرت کو بھی میرا جی کے پاس کیوں نہ پہنچا دیا جائے۔ پھر میں نے دیکھا کہ مجھ کو بعض اوقات اخلاق احمد میں میرا جی کی روح بولتی نظر آنے لگی اور میں اخلاق احمد سے ڈرنے لگا۔ یہاں تک کہ جب ایک مرتبہ اخلاق مجھ کو اپنے گھر لے گئے جو آبادی سے دُور اچھرے کے اُس پار جہاں اس ترقی یافتہ دنیا کے تمام آثار ختم ہو جاتے ہیں انسانوں میں سے صرف اخلاق وہاں پہنچ سکے ہیں وہ بھی اپنی انسانیت اسی طرف چھوڑ کر۔ جنگل بیابان۔ گہرے گہرے کھڈ۔ بھیانک خندق۔ خوفناک کھائیاں جھاڑ جھنکار اور ان سب میں گِھرا ہوا صرف ایک اکلوتا گھر۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ اب یہاں لاکر اخلاق ایک دم لمبے لمبے بال لگالیں گے۔

مالائیں پہن لیں گے۔ لوہے کے گرز ہاتھوں میں لے لیں گے اور یہ کہہ کر مجھ
کو وہم مجذوب کر دیں گے کہ میں ہی دراصل میراجی ہوں، انتقاماً مر گیا ہوں
مگر اخلاقاً زندہ ہوں اور اگر میں نے بھاگنے کی کوشش کی تو میرا آملیٹ
بنا ڈالیں گے۔ مگر میرا یہ اندیشہ اُس دن غلط نکلا۔ پھر بھی اخلاق کی طرف
سے بہت دن تک پوری طرح اطمینان نہیں ہوا البتہ یہ ضرور ہوا کہ اخلاق
کی اس مسلسل تبلیغ نے مجھ کو میراجی کی طرف واقعی متوجہ کر دیا۔ میں نے
ان کا لٹریچر پڑھا۔ اور ہر چند کہ اپنی ذاتی کور ذوقی کی وجہ سے مجھ کو
آزاد قسم کی شاعری سے نہایت گنوار قسم کی اُلجھن سی ہوتی ہے اور
میری اس اُلجھن پر ن۔م۔ راشد کو مجھ پر اس طرح ترس آتا ہے جیسے
کسی یتیم پر کسی مردِ مومن کو آنا چاہیئے۔ مگر اس یتیم العقلی کے باوجود مجھ کو میراجی
کے کلام میں ایک لذّت سی محسوس ہونے لگی اور اب میں اور بھی زیادہ ڈرا کہ
کہیں میرا انجام یہ تو نہ ہوگا کہ میں ترقی پسند بن کر مروں اور بلیڈنگ ودس بن
کر جیوں۔ مگر تجربہ سے ثابت یہ ہوا کہ میراجی اپنی خصوصیات میں ڈوبنے
کے بعد اب دوسرے شاعروں کے لئے سدِ سکندری بھی بنے ہوئے ہیں۔ اب
میں ان کی شاعرانہ عظمت کا دل سے معترف ہوں۔ ان کے وجدان کی گہرائیوں
کو بھی پا چکا ہوں۔ اخلاق سے ان کے تذکرے اب خود چھیڑ چھیڑ کر سنتا
ہوں۔ ان کے گیت بھی گنگنا لیتا ہوں جے جے ونتی میں نہ سہی میاں کی ٹوڑی

میں بھی۔ اور رفتہ رفتہ میراجی سے اس قدر قریب آچکا ہوں کہ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ میراجی اگر زندہ رہتے تو کیا مضائقہ تھا۔ مگر پھر میرا دل جواب دیتا ہے کہ مر گئے ہیں تو بھی کیا مضائقہ ہوا ایسے لوگوں کی زندگی اور موت میں فرق ہی کب ہوتا ہے وہ اب بھی زندہ ہیں اخلاق کی صورت میں زندہ ہیں۔ راشد کی صورت میں زندہ ہیں۔ صلاح الدین کی صورت میں زندہ ہیں۔ قیوم نظر کی صورت میں زندہ ہیں بلکہ میری صورت میں زندہ ہیں:

اپنے مضامین اپنی نظر میں

اپنے مضامین کو میں نے مختلف حیثیتوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مثلاً فرمائشی فہمائشی۔ نمائشی۔ معاشی اور پیدائشی مضامین ان میں سے ہر قسم ایسی ہے کہ جب تک میں خود اس پر روشنی نہ ڈالوں اس کی حیثیت کسی ایسے ڈاکٹر کے نسخہ کی رہے گی۔ جو دوا کا نام لکھنے کی بجائے دوا کا نمبر لکھا کرتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ میں اپنی اصطلاحات کا مفہوم خود بیان کر دوں۔

فرمائشی مضامین سے میری مُراد اُن مضامین سے ہے جو کبھی عنوان دے کر کبھی عنوان کے ساتھ ہی موضوع بھی دے کر اور بعض اوقات مضمون

کا نہایت تفصیلی خاکہ دے کر لکھوائے جاتے ہیں۔ کہ یہ مضمون پورا۔ اس طرح اور اس قسم کا لکھ دیجئے۔ گویا مضمون تو ہر کس لکھا یا ہوتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہوتی ہے۔ کہ اس حماقت کو میں کسی طرح قبول کر سکے اس مضمون کو اپنا نام دے دوں۔ پھر خواہ خودکشی ہی کیوں نہ کر لوں۔ اب مثلاً میں نے ایک مضمون لکھا سودیشی ریل جو کسی رسالہ میں چھپ گیا۔ اور اس پر نظر پڑ گئی کسی اور رسالہ کے ایڈیٹر صاحب کی۔ اب یا تو ان کا نہایت تفصیلی خط آئے گا یا اگر مقامی قصبہ ہوا تو وہ خود نہایت تفصیلی طور پر تشریف لے آئیں گے کہ صاحب ایسا ہی مضمون آپ مجھ کو بھی لکھ دیں۔ مثلاً دیکھئے نا کتنا اچھا موضوع ہے سودیشی ڈاک خانہ۔ اس مضمون کو اگر آپ اس طرح لکھیں کہ مثلاً آپ کوئی پارسل لے کر ڈاک خانے گئے ہیں۔ اور وہاں پارسل کلرک آپ سے کہہ رہا ہے۔ کہ وزن تو اس کا اتنا ہے مگر کہئے تو رعایت کر دیں۔ اور جب آپ اس پارسل کے لئے ٹکٹ خریدتے ہیں۔ تو اسٹیمپ کلرک مول تول کرتا ہے۔ اور پھر بمشکل تمام آپ کو بارہ آنے کا ٹکٹ سات آنے میں مل جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بڑی گنجائش ہے۔ اس موضوع میں عرض کیا ان سے کہ "بندہ نواز آخر آپ خود ہی کیوں نہیں لکھ لیتے" اپنے نزدیک وہ اس کو بھی لطیفہ سمجھ کر پہلے تو خوب ہنسے پھر جب اس لطیفہ سے لطف اندوز ہو چکے تو بڑی کسر نفسی سے فرمایا میں لکھ سکتا تو آپ سے کیوں عرض کرتا۔

اب ان کو سمجھانا پڑا کہ وہ در اصل لکھ چکے ہیں ان کو سمجھاتے ہوئے عرض کیا۔ دیکھئے نا جو کچھ آپ نے تجویز کی صورت میں اس مضمون کا خاکہ بتایا ہے وہی در اصل مضمون ہے۔ بس اسی کو آپ لکھ دیجئے۔ میں اس لئے فکر مند ہوں کہ میں اب آخر اس میں کیا لکھوں گا۔ مگر یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ اور یہاں مصیبت یہ کہ گھر اپنا اخلاق کی حدود سے بھی نہ گذر سکتے تھے۔ مگر جب عاجز ہی آ گئے۔ تو کہنا پڑا۔ حضور والا آپ تو مضمون کا موضوع اس طرح لیکر آ گئے ہیں۔ جیسے کسی درزی کے یہاں کوئی شخص اپنا کپڑا اور اپنی جسامت لے کر پہنچ جاتا ہے۔ کہ یہ کپڑا اس جسم کے لئے سی دو۔ میں آپ کو مشورہ دونگا۔ کہ پہلے گھر تشریف لے جایئے۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر درزی اور انشاپرداز میں جو لطیف سا فرق ہوتا ہے۔ اس کو محسوس کرنے کی کوشش کیجئے۔

اس فرمائشی مضمون سے بظاہر یوں نجات مل گئی مگر دوسرے دن معلوم ہوا۔ اس نے فہمائشی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی یہی حضرت ایک ایسے بزرگ محترم کے خط لے کر پہنچ گئے جن کے اختیار میں اور کچھ نہ سہی یہ تو تھا ہی کہ اگر ناراض ہو جائیں تو والد صاحب کو لکھ بھیجیں کہ آپ کے صاحبزادے سخت نالائق ہیں۔ اور ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ میں اپنی لڑکی کی قسمت ان سے جوڑوں۔ حالانکہ بظاہر بڑے پیار سے خط لکھا گیا تھا۔ اور بڑی شفقت برس رہی تھی۔ اس خط کے ہر دائرے اور ہر مرکز سے۔ مگر اس محبت اور

اس شفقت کا نہایت ہولناک انجام بھی تو نظر کے سامنے تھا۔ کہ اب انکار کر کے دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ ہوتا کیا؟ ہوا یہی کہ ان حضرات کے لکھائے ہوئے مضمون پہ گویا اپنا نام لکھ دیا۔ اور اب تمام دنیا سے جواب دہی کرتے پھر رہے ہیں۔ کہ آخر یہ کیا مار پڑ رہی تھی۔ کہ سودیشی ریل کے بجائے یہ حماقت کر بیٹھے، ظاہر ہے۔ کہ ہر ایک کو تو نہیں سمجھایا جا سکتا کہ یہ حماقت کن راستوں سے گذر کر اپنے پاس آئی تھی۔ اور وہ کیا اسباب تھے۔ کہ اس کو اوڑھنا ہی پڑا۔

اس قسم کے فہمائشی مضامین اکثر لکھنا پڑتے ہیں۔ اس لئے کہ عزت آبرو بڑی چیز ہے۔ اور نہ لکھنے کی صورت میں بھی بڑی چیز خطرے میں پڑ جاتی ہے تعلقات کے انقطاع کی دھمکی دی جاتی ہے۔ دوستی کے دشمنی میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ سامنے لا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اپنا نام اگر نہ اچھلوائیے تو ٹوپی اچھلوانے کی اجازت دیجئے۔ مگر اس فہمائشی سلسلہ کی سب سے خطرناک قسم حال ہی میں ایک دوست نے ایجاد کی ہے۔ کہ پہلے تو وہ نہایت شرافت اور انسانیت کے ساتھ فہمائشی خطوط لکھتے رہے مگر جب کامیاب نہ ہوئے تو ایک فہمائشی خط اس مضمون کا لکھ بھیجا کہ حضرت اگر آپ نے اب بھی مضمون نہ بھیجا تو میں ایک ایسا مضمون لکھ کر آپ کے نام سے چھاپ دوں گا۔ جس میں وہ تمام گمرہیاں ہوں گی۔ جن سے آپ

متحمل نہ ہو سکیں گے۔ کوشش کروں گا کہ املا کی بھی غلطیاں ہوں۔ انشا کی بھی ہوں۔ مذاق اور بد مذاقی کا امتیاز اُٹھ جائے۔ اور جس کو آپ مزاح لطیف کہتے ہیں۔ وہ پھکڑ پن بن کر آپ کے نام سے اس طرح منسوب ہو جائے کہ آپ کو مزاح نگار سمجھنے والے پھکڑ نگار تسلیم کر کے فاتحہ پڑھ لیں۔ ظاہر ہے۔ کہ اس فہمائش کے بعد کچھ نہ لکھنا خواہ مخواہ اپنے کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ لہٰذا لکھا ان کے ارشاد پر جو کچھ لکھا اُس کو آج کل فہمائشی مضامین کے ذیل میں لکھے ہوئے ہیں۔

نمائشی مضامین سے مراد اُن مضامین سے ہے۔ جو رسائل اور اخبارات کے نمائشی نمبروں کے لئے لکھنا پڑتے ہیں۔ یہ مضامین نا پہنائی طور پر نمائشی اور دردبھری طور پر معاشی ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی فرمائش بھی کی جاتی ہے اور اگر وہ رسالہ یا اخبار یہ خاص نمبر نکالنے کے سلسلہ میں جانبر ہو جائے تو کچھ نہ کچھ معاوضہ بھی مل جاتا ہے۔ جب کہ ہر ایک کو معلوم ہے۔ کہ ہمارے رسائل اور اخبارات عام نمبر نکالنے سے عموماً کترا تے ہیں۔ اور خاص نمبر نکالنے کے بہانے ڈھونڈھا کرتے ہیں۔ پہلے یہ جریدے اپنے سالانہ نمبر نکالا کرتے تھے۔ یا ایسا ہی کوئی اولوالعزم رسالہ ہوا۔ تو اس نے اپنا سالگرہ نمبر نکالنے کے علاوہ ایک نصف سالگرہ نمبر بھی نکال دیا۔ مگر اب عام نمبر خاص خاص موقعوں پہ نکلتے ہیں۔ خاص نمبر تو نکلتے ہی رہتے ہیں۔

مثلاً اقبال نمبر - آزادی نمبر - قائد اعظم نمبر - عید نمبر - بقر عید نمبر - میلاد نمبر - اُردو نمبر - اور خدا جانے کون کون نمبر - ان نمبروں کے لئے اگر آدمی لکھنے بیٹھے تو زندگی کی مہلتیں اس کو نہایت مختصر محسوس ہوں - مگر پھر بھی لکھنا ہی پڑتا ہے - سب اخباروں اور سب رسالوں کے لئے تو خیر نا ممکن ہے لکھنا مگر چند کے لئے تو لکھنا ہی پڑتا ہے ، بات یہ ہے - کہ اخبارات اور رسائل کی تعداد حدودِ شمار سے باہر ہے - اور یہ سب بے شمار اخبار اور رسالے یہ بیشمار خاص نمبر نکالتے ہی چلے جاتے ہیں - ایک مرتبہ تین عزیز قریب ایک قسم کے رسالے یعنی اقبال نمبر نکال رہے تھے اس لئے تینوں کے لئے مضامین لکھنا از بس ضروری نہ تھا بلکہ ضروری کہ زندگی اور موت کی قسم کا سوال آ پڑا تھا - یعنی لکھیں تو خود مریں اور نہ لکھیں تو یقین یہ دلایا گیا تھا - کہ لکھوانے والے خود کشی کریں گے لہذا ایک مضمون لکھا مرکھپ کر - اب سوال یہ تھا - کہ دوسرا اور تیسرا کیونکر لکھا جائے - آخر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ اسی مضمون کا درمیانی حصّہ اگر پہلے لکھ دیا جائے - آخری حصّہ درمیان میں لکھ دیا جائے اور ابتدائی حصّہ آخر میں آجائے - تو معلوم ہوگا کہ جیسے نیا مضمون ہے - لیجئے دوسرا مضمون بھی ہو گا - اب اسی فارمولا سے تیسرا مضمون تیار کر لیا - کہ تیسرے مضمون میں آخری حصّہ شروع میں تھا - درمیانی حصّہ آخر میں تھا - اور آخری حصّہ کی جگہ پہلا حصّہ تھا - یہ تینوں

مضامین تین مختلف اقبال نمبروں میں چھپ گئے۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ ہُوا۔ ایک بہت بڑے نقاد قسم کے بزرگ نے صرف یہ لکھا کہ شوکت تھانوی کے یہاں خیالات وافکار کی تکرار اور توارُد کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔

مثلاً ان کے تین مضامین تین مختلف رسائل میں اقبال کے متعلق نکلے ہیں۔ اور وہ تینوں معلوم ہوتا ہے ایک ہی سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ کس قدر دُور کی کوڑی لاتے ہیں یہ بزرگ، مگر ایمان کی کہئیے کہ خود ان سے بھی زیادہ دُور کی کوڑی ہم لائے تھے یا نہیں۔

اب ذرا معاشی مضامین پر غور کر لیجئے۔ یہ وہ مضامین ہیں جن کو درزی کا ٹھیکہ کہنا چاہیئے۔ یہ میرے مضامین کی بڑی زرخیز قسم ہے۔ اور یہاں قائل ہونا پڑتا ہے۔ کہ یہ ادب برائے ادب قسم کی باتیں محض ڈھکوسلے ہیں۔ اصل چیز ہے ادب برائے چک اور چک برائے بنک یہ مضامین وہ بلند حوصلہ رسائل اور اخبارات لکھواتے ہیں جو خواہ فرمائشی رنگ اختیار کریں۔ خواہ فہمائشی صورت ان کو ہر قسم کا حق پہنچتا ہے۔ اس لئے کہ وہ معاوضہ دیتے ہیں نہ وہ کوئی دھمکی لاتے ہیں نہ کوئی سفارشی خط نہ عزیزداری کا حوالہ دیتے ہیں نہ ہم وطنی کا حق جتاتے ہیں۔ بلکہ صاف بات یہ کرتے ہیں۔ کہ

کیا خوب سودا نقد ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اب اگر ان

مضامین کو آپ ادبی کسوٹی پہ جانچیں تو یہ آپ کی زیادتی ہوگی جو مضامین
اس معاملت پر لکھے جائیں کہ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا پاؤ گے۔ ان
مضامین کو ادبی معیار پر جانچنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ آپ کو کیا معلوم
کہ اُن مضامین کے لکھتے وقت کیسے کیسے راحتِ جاں قسم کے خیالات
کی آماجگاہ بنا رہتا ہے ذہن۔ قلم لکھ رہا ہے مضمون، اور دماغ سوچ رہا ہے،
کہ جب اس کا روپیہ ملے گا تو ایک تو آئے گا ذرا اعلیٰ قسم کا
سگریٹ کیس اور اس پر بنوائیں گے اپنا مونوگرام تاکہ جب کسی کے سامنے
سگریٹ نکال کر پیش کریں۔ تو وہ بھی مرعوب ہو جائے اس قسم کی چیزیں
آدمی کو خواہ مخواہ بھاری بھرکم بنا دیتی ہیں سگریٹ چاہے ایک ہی ہو
مگر سگریٹ کیس اگر شاندار ہے تو رعب پڑے بغیر نہیں رہتا۔ قلم
چل رہا ہے۔ اور دماغ میں ایک دوسرے خیال نے انگڑائی لی کہ سگریٹ
کیس سے زیادہ ضروری ہے گھڑی۔ دوسروں سے وقت پوچھنا پڑے
شرم کی بات ہے۔ یہ آلۂ توضیح اوقات خود اپنے پاس ہونا چاہیئے۔ زیور
کا زیور۔ اور پھر وقت ایک خود بھی کام کی چیز ہے۔ قلم چل رہا ہے۔ اور دماغ
میں ایک تیسرا خیال آیا کہ اس مضمون کا معاوضہ ملتے ہی سب سے پہلے
تو دھوبی کا حساب چکانا چاہیئے۔ ورنہ یہ ساری سفید پوشی کسی دن دھری
رہ جائے گی۔ اتنے بڑے ادیب سے نہایت بے ادبی کے ساتھ

تقاضے کرنے لگتا ہے۔ کسی دن پکڑے ہی تو مار ملے۔ ان ہی خیالات میں مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ اور معاوضہ مل جاتا ہے۔ مگر قیامت یہ ہے۔ کہ ان مضامین کو بھی لوگ تنقیدی نظر سے پڑھتے ہیں۔ اب اُن کو کیسے سمجھایا جائے۔ کہ صاحب!! اس قسم کی تنقید آخر آپ ترکاریوں پر کیوں نہیں کرتے جو بازار میں بکنے کے لئے ڈھیر ہوتی ہیں۔ اس قسم کی تنقید آخر آپ کسی کباڑیے کے نیلامی فرنیچر پر کیوں نہیں کرتے۔ آخر یہ بھی تو بکاؤ مال ہے۔

فرمائشی۔ فہمائشی۔ نمائشی اور معاشی کے علاوہ مضامین کی ایک اور بھی قسم ہے یعنی آزمائشی اس قسم کا میں نے اس لئے ذکر نہیں کیا ہے۔ کہ ان مضامین سے میں ہمیشہ بھاگا ہوں۔ اور اب تک خدا نے مجھ کو مضامین کی اس قسم سے بچایا ہے۔ یہ وہ مقابلے کے مضامین ہوتے ہیں۔ جن کے اعلان کبھی سرکاری طور پر اور کبھی نجی طور پر اخبارات میں ہوتے ہیں۔ کہ اس موضوع پر بہترین مضمون لکھنے والے کو پہلا انعام اتنا اور دوسرا اتنا اور تیسرا اتنا دیا جائے گا۔ اور یہ کچھ نہیں لکھا جاتا کہ چوتھے نمبر پر آنے والے کو اور اس سے بھی بہتر پوزیشن حاصل کرنے والوں کو کیا کیا سزائیں دی جائیں گی۔ بس اعلان یہ ہوتا ہے۔ کہ مضمون آٹھ صفحات کا ہو خواہ آپ کلام پاک پر قل ہو اللہ لکھنے والے ہوں یا آپ سائن بورڈ کے خطاط ہیں وہ

آٹھ صفحے بھر دیں فیصلہ کرنے والوں کی کمیٹی کا اعلان ہوتا ہے آخری تاریخ کا
پھر دوسری احتیاطیں کہ کاغذ کے صرف ایک طرف لکھیے۔ بائیں ہاتھ
میں قلم پکڑ کر نہ لکھیے اور اگر آپ کا بایاں ہاتھ داہنا ہو۔ تو داہنے ہاتھ سے
جو آپ کا بایاں ہوگا۔ قطعی پرہیز کریں۔ میں اس جھگڑے میں کبھی نہیں پڑا
اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ انعام کی بڑی سے بڑی رقم بھی مجھ کو اس
طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس لئے کہ میرا ہاتھ دیکھ کر فراست الیدہ کا ایک ماہر
یہ بات پہلے ہی بتا چکا ہے۔ کہ تم کو کسی لاٹری۔ کسی معمّا اور اس قسم کے کسی
مقابلے کا انعام کبھی نہ ملے گا۔ رہ گئی اب ایک آخری قسم یعنی پیدائشی مضامین
یہ مضامین وہ ہیں جن کے متعلق مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا تھا کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یہ مضامین دراصل میں خود اپنے لئے لکھتا ہوں اور آپ سے زیادہ خود
ہی خوش ہوتا ہوں۔ خود لکھتا ہوں اور خود ہی اپنے کو سناتا ہوں۔ خود ہی اپنے کو
داد دیتا ہوں۔ اور خود ہی کسر نفسی سے اس داد کو وصول کرتا ہوں۔ کہیں کس
قابل ہوں۔ مگر اس قسم کے مضامین بہت کم ہوتے ہیں۔ لوگ میرے مضمون
سودیشی ریل کو لے اڑے اور میں محض اس خیال سے چپ ہو رہا کہ ٹھیس نہ
لگ جائے۔ اب اپنا مضمون شاہین بچے مجھ کو سودیشی ریل سے کہیں زیادہ
پسند ہے اس لئے کہ اقبالیات کو لکھ کر مجھے وہ مسرت اور وہ اطمینان حاصل

نہیں ہوا۔ جو خوشی شاہین بچے لکھ کر حاصل ہوئی۔ اسی طرح بیشمار ایسے مضامین ہیں جن کو دوسرے پسند کرتے ہیں۔ مگر میں ان کو اتنا پسند نہیں کرتا۔

اب اگر مجھ کو غمِ روزگار اور فکرِ معاش دونوں سے آزاد کرکے خود اپنے مضامین پر نظر ڈالنے کا موقع دیا جائے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ بہت ہی کم سخت جان مضامین ایسے نکلیں گے جن کو میں باقی چھوڑ دوں باقی سب ردی کی ٹوکری میں نظر آئیں گے۔ لہذا خیریت اسی میں ہے۔ کہ مجھ کو اس طرف متوجہ نہ کیجئے۔ اور میرے مضامین کو میری نظرِ بد سے بچائیے ؎

(باجازت ریڈیو پاکستان لاہور)

ہم زلف کا بکرا

مقروض پر قربانی فرض نہیں ہے۔

مگر خود مقروض کی قربانی فرائض میں داخل ہو جاتی ہے اگر اس کے متعلقین قصابی پر کمر باندھ لیں۔

مگر یہ قصہ کچھ بیچ اُدھر سے شروع ہو گیا۔ مناسب ہو گا اگر یہ بپتا شروع سے سنائی جائے۔ بات یہ ہے کہ عید ہو یا بقر عید میں فطرتاً تہواروں سے کچھ بھاگتا ہی ہوں۔ اور اس بھاگنے کی وجہ غالباً وہی مالی پریشانی ہے جس میں از روئے قاعدہ مبتلا تو نہ ہونا چاہیئے مگر جب قسمت ہی میں یہ پریشانی لکھی ہو تو قسمت کے لکھے کو مٹانا تو ظاہر ہے کہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں، اور جہاں تک میرا خیال ہے سچ ہی کہتے ہیں کہ بندۂ خدا تو اچھا خاصہ کماتا ہے تنخواہ جتنی نہ ہونا چاہیئے یعنی اُتنی ہے، آمدنی کے وسائل کچھ اور بھی ہیں۔ خوش پوش بھی ہے اور خوش خوراک بھی۔ کبھی کبھی تو ایسی دریا دلی دکھاتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں مگر اُس سے زیادہ دنگ اُس وقت ہوتے ہیں جب پتہ چلتا ہے کہ خیر سے بوٹی بوٹی قرضوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اب ان حضرات کو کیا سمجھایا

جائے کہ یہی دریا دلی تو ہے جس نے ڈبو رکھا ہے اور سچ پوچھیے تو اس میں بھی اپنا اتنا قصور نہیں ہے جتنا سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔ کاش ان کو معلوم ہوتا کہ ایک غیرت دار آدمی ڈھول لے کر اپنا ہر راز نہیں پیٹ سکتا۔ مگر آخر وہ وقت بھی آتا ہے جب سب کچھ اگل دینا پڑتا ہے۔ اسی قسم کا یہ وقت بھی ہے۔

ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

صاحب یہ افسانہ شروع ہوتا ہے میری شادی سے بلکہ ٹھہریئے میری شادی سے بھی نہیں میری بیوی کی بڑی ہمشیرہ کی شادی سے جو میری شادی سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے۔ میری بیوی کی بڑی بہن کی شادی ایک ایسے صاحب سے ہوئی ہے جن کے والد مرحوم میرے والدِ مرحوم سے زیادہ فرض شناس تھے اور اپنے صاحبزادے کے متعلق اُن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ان حضرت کو دنیا میں کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھے گا لہٰذا وہ بے چارے عین اُس وقت مرگئے جب بنک میں کافی روپیہ جمع ہو چکا تھا۔ ایک کوٹھی بھی بن چکی تھی۔ اور ایک آدھ مکان بھی خرید چکے تھے۔ برعکس اس کے میرے والدِ مرحوم نے بھی خدا کے فضل سے کمایا تو بہت اور جمع بھی بہت کچھ کیا مگر غلطی اُن سے صرف یہ ہو گئی کہ بروقت انتقال فرمانے کا خیال نہ رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا جو کچھ جمع کیا تھا وہ کچھ تو بیکاری میں اپنے اوپر صرف کیا اور کچھ میری تعلیم پر، یہاں تک کہ ان کو خدا نے عمر میں اتنی برکت عطا فرمائی کہ بنک کا سارا روپیہ خرچ ہو جانے کے بعد پہلے ایک مکان فروخت ہوا، پھر میری تعلیم کے

کے آخری سال کی لاج رکھتے ہوئے دوسرا مکان نیلام پہ چڑھا اور تیسرا غریب خانہ والد مرحوم کی علالت کی نذر ہو گیا اور قصہ مختصر اس طرح ہوا کہ یہ خاکسار نہ صرف یتیم رہ گیا بلکہ قطعاً بے سہارا بھی، وہ تو کہیئے کہ پڑھا لکھا کچھ کام آ گیا۔ اور ایک سرکاری ملازمت ایسی مل گئی کہ خواہ مخواہ کا بھرم قائم ہو گیا۔ درشن تھوڑے سہی مگر نام بڑے ہو گئے۔ تنخواہ بھی معقول ملنے لگی اور آثار ایسے پیدا ہو گئے کہ شاید زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ مگر میں اسی وقت قسمت مسکرا رہی تھی، اور مشیت کہہ رہی تھی کہ دیکھو تو سہی برخوردار ہم کو کیسا چوپٹ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ کچھ دوست اِدھر سے دوڑے کچھ عزیز اُدھر سے دوڑے اور نتیجہ اس دوڑ دھوپ کا یہی نکلا کہ سسرال میں ڈھولک ٹھنکی۔ ع

ہریالا بنڑی والا دو تو آنگن میں لا کے لگا دے

اور اِدھر ہریالا ہے کہ اس سے مانگ اُس سے مانگ اپنے کو قرض سے پاٹتا چلا جا رہا ہے۔ مختصر یہ کہ قاضی جی کی بلا سے ان کو کسی سے کیا غرض وہ تو آئے اور آدھی عربی آدھی اردو بول دو زندگیوں کا فیصلہ کر چلے تب بلاؤ چوپلی پڑے اور پھر پلاؤ کے ہاتھ ملاتے ہوئے چلتے بنے۔ اہل محفل میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جس نے ہمدردی کی آدھی بات بھی کی ہو۔ جو ہے مبارک باد دے رہا ہے اور ہنس رہا ہے کہ چلو ایک چنڈ اور پھنسا یہ بھی کیا یاد کرے گا۔

قصہ کو کہاں تک طول دیا جائے کوئی دلچسپ بات ہو تو طول بھی ناگوار

نہیں ہوتا۔ ٹریجڈی تو جس قدر مختصر ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ لہٰذا قصہ کوتاہ بیگم صاحبہ گھر کی مالکہ بن کر تشریف لے آئیں۔ ظاہر ہے کہ شروع شروع کے دن جو چونچلے چاؤ کی بہار اور چاؤ چونچلوں کے گلزار کھوتے ہی ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ ان ہی بیگم صاحبہ سے پتہ چلا کہ او عاقبت نااندیش شوہر تو نے مجھ سے شادی کر کے زندگی بھر کا عذاب اپنے سر لے لیا ہے اور وہ عذاب تھی۔ ان کی والہانہ محبت اور شوہر سے کورانہ عقیدت، شوہر کے رشتوں کو بھی جن باتوں کا علم نہ تھا وہ اس کے متعلق بیگم صاحبہ کے میکے بھر میں مشہور تھیں۔ مثلاً کوٹھی بنانے کے لئے جو زمین بیگم صاحبہ کے اس خاکسار شوہر نے خرید رکھی ہے اس کا علم خود اس خاکسار کو یکایک اس طرح ہوا کہ ایک کھانے پر جس میں سب ہی ضروری سسرالی عزیز موجود تھے اور سب سے زیادہ ضروری رکن یعنی بیگم صاحبہ کے بڑے بہنوئی بھی تشریف فرما تھے۔ خوشدامن صاحبہ نے اپنے اس خاکسار نئے نویلے داماد سے بڑے دلار کے ساتھ فرمایا:-

"ارے میں نے کہا تاجدار دولہا کوٹھی کی زمین کا مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا تم نے؟"

چہرے پر سوالیہ نشان لٹکا کر اب جو میں نے نظر اٹھائی ہے تو بیگم کی چشم فسوں ساز میں عجیب تاکیدیں تھیں۔ اتنا تو میں ضرور سمجھ گیا کہ ان کا منشا یہ ہے کہ میں اس بات کو نباہ لے جاؤں لیکن یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ کیوں اور کس طرح مجبوراً کسر نفسی سے کام لیکر عرض کیا:-

"وہ کونسی ایسی قابلِ ذکر بات تھی؟"

بیگم کے چہرے پر سکون اور بشاشت کے آثار دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جواب ٹھیک ہی دیا ہے مگر عین اسی وقت ہم زلف صاحب نے مُرغ کی ٹانگ بھنبھوڑتے ہوئے فرمایا "کس سڑک پر لی ہے زمین؟"

بیگم نے پھر اپنی چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھوں سے گھورا۔ مطلب یہ تھا کہ کہا دو جلدی سے کسی سڑک کا نام۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ فوراً ہی ایک سڑک کا نام زبان پہ آگیا:۔

"جی وہ مال روڈ ہی سمجھیئے۔"

بیگم نے اس بُری طرح مُنہ بنایا کہ میرے ہاتھ سے نوالہ گرتے گرتے بچا۔ غالباً جواب غلط ہو گیا تھا۔ چنانچہ خوشدامن صاحبہ نے فوراً آنکھیں گول کر کے فرمایا:۔

"مال روڈ؟ یہ تو آج کہہ رہی تھی چوبرجی۔"

عرض کیا جی ہاں۔ وہ نہ تو بالکل مال روڈ ہے نہ دراصل چوبرجی ہے اس کو کچھ مال روڈ سمجھیئے اور کچھ چوبرجی۔"

ہم زلف صاحب نے فرمایا "آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ پُرانی انارکلی کے قریب ہے گویا۔"

جلدی سے رفع شر کے لئے کہہ دیا "جی ہاں، یہ آپ کا اندازہ درست ہے۔

بات یہ ہے کہ پرانی انار کلی کے بھی اس حصہ میں سمجھئے جہاں سے مال روڈ اور گویا چوبرجی کا یکساں فاصلہ رہ جاتا ہے۔

ہم زلف صاحب نے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہوں یہ کس صاحب کی زمین تھی؟"

بیگم نے پھر بڑی بیچارگی سے گھورا لہٰذا ہم نے جلدی سے کہدیا۔ "یہ تھی تو دراصل شیخ بشمبر دیال صاحب کی مگر ــــــــــ"

ہم زلف صاحب نے فیرنی کا چمچہ منہ کے قریب لا کر واپس کرتے ہوئے کہا۔ "شیخ اور پھر بشمبر دیال؟"

بیگم نے پیشانی سے پسینہ پونچھا مگر میں نے جلدی سے ہنس کر کہا۔ "میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کو اس نام پر حیرت ہوگی۔ یہ دراصل ایک نومسلم خاندان تھا۔ نام ان لوگوں نے نہیں بدلے صرف شیخ لگا کر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔"

ہم زلف صاحب نے فیرنی کا ٹھنڈی کیا ہوا چمچہ منہ میں رکھ لیا۔ بیگم کے چہرے پر بھی بشاشت آ گئی کہ کیا حاضر جواب شوہر پایا ہے۔ اور میں نے جلدی سے فقرہ پورا کیا۔ "جی تو یہ زمین دراصل تھی تو شیخ بشمبر دیال صاحب کی مگر انہوں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دے دی تھی لہٰذا میں نے ان کے شوہر سے خریدی ہے۔"

عین اسی وقت دسترخوان سے سب اٹھ گئے اور میں اس طرح اٹھا جیسے امتحان کا پرچہ کر کے کوئی ایسا طالب علم اٹھتا ہے جس نے نقالی کی ہو اور پھر بھی یقین نہ ہو کہ نمبر ملیں گے یا نہیں۔ کھانے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور ہم زلف

صاحب مسلسل اپنی امارت کا پروپیگنڈا کر رہے تھے "ارادہ ہے کہ ۵۵ء کا ماڈل خرید لوں اور موجودہ کار نکال دوں۔ فریجیڈیر بھی صبح سے خراب تھا، یوں پھر بازاری برف کا پانی پیا ہے۔ سگریٹ یہ نہیں پی سکتا، موٹر میں ڈبہ ہے کسی سے منگا لیجیے بڑی بری عادت ہوتی ہے۔ مصری سگریٹ کی بھی کراچی جانا ہے مگر ایئر کنڈیشن کوچ میں ایک ساتھ تین چار برتھ نہیں مل رہے ہیں۔" اور یکایک مخاطب ہو گئے اس طرف "کیوں صاحب آپ دلوا سکتے ہیں برتھ؟" بیگم نے فوراً کہا "یہ تو اشارہ بھی کر دیں تو مل جائیں، تمام بڑے بڑے افسران کے دوست ہیں۔"

ہم زلف صاحب نے فرمایا "بس تو پھر کیا ہے ابھی دلوا دو نا برتھ۔"

عرض کیا "ذرا مشکل ہے آج کل۔"

بیگم نے گھور کر کہا "کیوں مشکل کی کیا بات ہے؟"

عرض کیا "آجکل ریلوے نے برتھ کنٹرول شروع کیا ہے۔"

بیگم خوش ہو گئیں، باقی عورتیں جھینپ گئیں۔ ہم زلف صاحب نے ہنسنے کی کوشش فرمائی اور شکر ہے کہ اسی قصے پر سب اپنے اپنے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے گھر آکر سب سے پہلا سوال بیگم سے یہی کیا کہ "بھلا یہ کوٹھی کی زمین کا کیا قصہ تھا، میں تو حیران ہی رہ گیا۔ یہ بات کیا تھی آخر؟"

بیگم نے نہایت بے پروائی سے کہا "خیر وہ نبھ گیا آپ نے جواب ٹھیک ہی دے دیے میں تو گھبرا گئی تھی کہ پھوٹا آج بھانڈا۔"

اور اب جو بیگم صاحبہ سے تفصیلی گفتگو اسی کوٹھی کی زمین کے متعلق ہوئی ہے تو پتہ چلا کہ ان کے گھر میں نہایت سخت تقابل ہو رہا ہے دونوں دامادوں کا۔ بڑے داماد چونکہ دولت مند بھی ہیں اور شیخی خورے بھی لہٰذا ان کی وجہ سے میری غریب بیوی کا ناک میں دم ہے۔ وہ طرح طرح سے ۔رات اسی کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ سسرال والوں سے اعتراف کرا لیں کہ وہ بہت اونچے ہیں اور یہ جو دوسرا داماد آیا ہے نہایت ہیچ ہے۔ بھلا کون بیوی یہ گوارا کر سکتی ہے کہ اس کا شوہر کسی سے مقابلہ میں کمتر ثابت ہو لہٰذا ان بیچاری نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر رکھا ہے۔ بے شمار بے سر و پا افسانے اپنے شوہر کے متعلق اپنے خاندان میں مشہور کر رکھے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک افسانہ یہ کوٹھی کی زمین کے متعلق تھا۔ یہ تمام روداد سُن کر عرض کیا کہ "نیک بخت۔ اگر یہ جھوٹ بولنا ہی تھا تو کم سے کم مجھ کو تو بتا دیا ہوتا کہ تیار ہو جاؤں۔ اور اب بھی سویرا ہے جو باتیں اور بنا چکی ہو ان کے متعلق مجھے تو سمجھا دو۔"

بیگم نے آبدیدہ ہو کر کہا "آپ اپنا تبادلہ کہیں دور کرا لیں۔ میں یہ دن رات کے تقابل برداشت نہیں کر سکتی۔"

لعنت ہے اس شوہر پر جو اپنی نئی نویلی دلہن کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو دیکھے اور اس کی دلدہی نہ کرے چنانچہ میں نے کہا "پاگل ہوئی ہو۔ تقابل میں تم ہی جیتو گی۔ تمہارا میاں پڑھا لکھا۔ وہ حضرت جاہل لٹھ۔ تمہارا میاں اتنی اچھی جگہ پر ملازم

وہ ایک عام شہری جس کا نہ اثر نہ رسوخ۔"

بیگم نے کہا "دنیا یہ نہیں دیکھتی۔ دنیا چار پیسے ظاہری شان و شوکت اور ٹیپ ٹاپ کے نمونے دیکھتی ہے۔ اب دیکھئے چار پانچ دن کے بعد عید ہے قدم قدم پر آپ کا اور ان کا مقابلہ ہو گا۔"

میں نے بیوی کو چمکارا "کوئی پروا نہیں۔ ہر مقابلے میں تم جیتو گی۔"

چنانچہ وہ واقعی جیتیں اور اس طرح کہ جہاں ان حضرت نے دس روپے صرف کئے وہاں اس خاکسار نے بیس لگائے۔ جس ملازم کو ان صاحب نے دو روپے کے پھل اور مٹھائیاں بھیجیں ادھر سے بیس پچیس روپے کی ڈالی گئی۔ اور واقعی تمام سسرال میں دھوم تھی اس خاکسار کی سیر چشمی اور دریا دلی کی۔ اور اب آگئی ہے بقر عید اور اطلاع موصول ہوئی ہے کہ ان حضرت کے یہاں چالیس روپے کا بکرا آیا ہے قربانی کے لئے لہٰذا بیگم صاحبہ کا اصرار ہے کہ اگر تم اونٹ یا گائے نہیں کر سکتے تو بھی یا تو پچاس ساٹھ روپے کا دنبہ منگاؤ ورنہ انہوں نے ایک بکرا منگایا ہے تم دو کا انتظام کرو۔ اور یہاں یہ فکر ہے کہ پچھلی عید کے سلسلے میں جو قرض کا بار لاد لیا تھا۔ اس کی موجودگی میں قربانی جائز بھی ہے یا نہیں مگر وہ جائز ہو یا نہ ہو۔ اپنی قربانی تو دینا ہی پڑے گی۔ اس لئے کہ بیگم کے تیور روز بروز قصائیوں کے ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ خاکسار اب جگالی کرنے لگا ہے۔

خان بہادر صاحب

جس دن صبح اُٹھ کر کلمہ پڑھنا بھول جائیں۔ یا آنکھ کھولتے ہی کوئی ایسی ویسی چیز نظر آجائے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ اُس دن خان بہادر ضرور نازل ہوں گے۔ اور اگر خدا نخواستہ آنکھ کھولتے ہی وہ حضرت ہی نظر آجائیں۔ تو بہتر یہ ہے کہ اُس دن جو جاوے بھی گزر جائے۔ وہ کم ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ گرمی کا موسم ٹھہرا۔ خان بہادر صاحب سے ڈر کر کوئی کہاں تک باہر نہ لیٹے۔ اور باہر لیٹنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ خان بہادر صاحب کا خطرہ برحق ہو جاتا ہے۔ وہ جو ایک ٹھمری کے بول ہیں۔ کہ

آنگن میں مت سو

ان کی قدر کچھ اے۔ آر۔ پی والے نہیں۔ بلکہ خان صاحب بہادر کے نیاز مند بھی کرتے ہیں۔ کوٹھی کے سبزہ زار پر پلنگ بچھا کر نہایت اطمینان سے رات کو سوئے اور صبح ہوتے خان بہادر صاحب نے آ دبوچا۔ اب کیجئے اُن سے ہر اُس موضوع پر بحث جو وہ آتے ہی چھیڑ دیں گے۔ اور اس بحث میں یا تو جابجا ان کی تائید کیجئے ورنہ فوجداری کے لئے تیار رہیے۔

اسم گرامی ہے جناب کا غلام دستگیر مگر نام تو شاید اب خود ان کو بھی یاد نہ ہو۔

اپنے پرائے آئے گئے سب خان بہادر صاحب کہتے ہیں۔ بلکہ خان بہادر صاحب کی خوشی بھی اسی میں ہے۔ کہ مخاطب کرنے والے ان کو خطاب ہی سے مخاطب کریں۔ لاکھ سمجھایا کہ حضور اب اس عہد غلامی کے خطاب کی کیا وقعت ہے۔ مگر یہ بات تو ان کی سمجھ میں اب کیا اس وقت بھی نہ آئی۔ جب مسلم لیگ کی تحریک پر ایک سے ایک خطاب یافتہ نے اپنے خطاب واپس کئے اور بڑے بڑے دو سطری اور سہ سطری خطابوں والے سب خطاب واپس کر کے بقلم خود رہ گئے۔ خان بہادر صاحب سے بھی اصرار کیا گیا۔ مگر آپ کا جواب یہی تھا۔ کہ حضت کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ قبر کا تعویذ اس خطاب سے محروم رہ جائے۔ طرح طرح کے زور لگائے گئے بڑے بڑے اثر ڈالے گئے۔ مگر توبہ کیجئے۔ آپ خان بہادری کو کلیجے سے لگائے بیٹھے رہے اور اب تک انگریزوں کے سجادہ نشین بنے بیٹھے ہیں۔

انگریزوں کے سجادہ نشین کہنا تو شاید شاعری ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ اپنی حاضری کے سوگوار ضرور ہیں۔ جب تشریف لائیں گے آزادی سے نالاں۔ پاکستان سے بیزار اور اس خود مختارانہ زندگی سے عاجز تشریف لائیں گے۔ بیتے ہوئے دور کی یاد میں بے شمار ٹھنڈی سانسیں ان کے پاس ہر وقت موجود ہیں۔ بیٹھ گئے تو ایک سے ایک مسٹر ولیم اور سر جان مور کے تذکرے ان سے سن لیجئے کیا کوئی اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے بیان کریگا۔ جس قدر وہ انگریز حکام کے افسانے مزے لے لیکر سنانے تھے اور اٹھتے بیٹھتے قول بس یہی تھا۔ صاحب حکومت تو کر گیا

انگریز"۔

آج بھی اپنا یہی قول لیے صبح صبح تشریف لائے اور مجھے دانی اُٹھا کر رُخِ روشن دکھایا ہی تھا۔ کہ دل دھک سے ہو گیا۔ کہ صبح صبح زیارت ہوئی ہے۔ خدا ہی خیر کرے جشنِ آزادی کا مبارک دن اور آغاز ہوا ہے اس کا اس نحوست سے۔ مگر کر ہی کیا سکتے تھے۔ منافقانہ خوش خلقی سے خیر مقدم کرنا پڑا۔ اور خان بہادر صاحب کرسی کھسیٹ اطمینان سے ناشتے میں بھیجہ کھانے بیٹھ گئے۔

"کہیے مولانا آج تو آپ کا جشنِ آزادی ہے"۔

سمجھ بجھی جبرت سے عرض کیا "میرا جشنِ آزادی کیسا خان بہادر صاحب کیا یہ آپ کا جشنِ آزادی نہیں ہے"!

ایک عجیب طنزیہ تبسم ان کے موٹے موٹے ہونٹوں پہ تھرک کر رہ گیا" اس قسم کے جشن آپ ہی کو مبارک رہیں بندہ ان سپاٹ قسم کے جشنوں کے قائل نہیں ہے۔ میاں جشن ہم نے دیکھے ہیں اپنے زمانے میں۔ یہ نہیں کہ بس کو ٹنک بار ریج ہوئی اور جشن ختم۔ اللہ اکبر کیسے کیسے جشن دیکھے ہیں انگریزوں کے زمانے میں بھی"۔

آگ ہی تو لگ جاتی ہے انگریزوں کے زمانے کا ذکر سن کر۔ جل کر عرض کیا۔ کیا آپ ہر وقت غلامی کے دور کو سراہتے رہتے ہیں"!

آنکھیں گول کر کے بولے "بندہ نواز سراہتا یوں رہتا ہوں کہ حکومت کر گیا ہے انگریز۔ بات بنانے کی بات دوسری ہے ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ زمانہ بھلایا نہیں

جا سکتا۔ ایک سے ایک جیتین اس زمانے میں بھی ہوتے تھے اور وفاداروں کو وفاداری کے صلے ملتے تھے۔ وہ تو کہیئے قسمت ہی میں یہ آزادی لکھی تھی ورنہ مسٹر ڈارلنگ کمشنر کہا کرتے تھے مجھ سے کہ دل خان بہادر صاحب، ہم آپ کو او۔ بی۔ ای کریگا بلکہ وہ سفارش بھی کر چکا تھا اور اگر خطابوں کی یہ ناقدری نہ کی جاتی تو آ ہی رہا تھا او۔ بی۔ ای کا خطاب بھی۔"

جی چاہا کہ اس انگریز پرست بڈھے کو انگریزی ہی میں ڈانٹ کر نکال دیں کہ گیٹ آوٹ مگر ہم ٹھہرے اُس قوم کے فرد جو گھر آئے ہوئے انگریز کو بھی صدیوں کے بعد نکال سکا ہے اور وہ بھی نہایت اخلاق اور شرافت کے ساتھ، لہٰذا خون کے گھونٹ پی کر خان بہادر صاحب سے صرف اس قدر عرض کیا:۔

خان بہادر صاحب حیرت ہے کہ آپ ان دو لفظی خطابوں کے معاوضے میں صدیوں غلامی کرنے کے بعد بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ اصل عزت ان خطابوں سے حاصل ہو سکتی تھی یا اب حاصل ہوئی ہے جب آپ غلامی کے یہ طوق اُتار کر آزاد ہوئے ہیں اور آپ کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ آپ دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے آزاد فرد ہیں۔

خان بہادر صاحب نے پان کو ایک گال سے دوسرے گال میں تبدیل کرتے ہوئے فرمایا، میاں کیسی باتیں کرتے ہو بخدا جی نہیں چاہتا اب کچھ کہنے کو اور ایک وہ زمانہ تھا کہ ہزاروں رنگروٹ خود میں نے بھرتی کرا دیئے۔ مگر وہی بات کی قدر ہوتی

تھی ان کاموں کی تعریف کی جاتی تھی ان کاموں کی سب سے پہلے مجھ کو قیصر ہند مڈل ملا تھا حوصلے اور بڑھ گئے اور میں نے اور کام کیا اب جو خطابوں کی فہرست نکلتی ہے تو خان صاحب بنے بیٹھے ہیں۔ دربار ہوا اس میں بلائے گئے خود گورنر بہادر نے جو انگریز ہز ایکسیلینسی تھا اپنے ہاتھ سے بجدا تمغہ لگایا تھا۔ میرے سینے پر اس خوشی میں جیب میں ڈالی لیکر گیا ہوں مسٹر ڈارلنگ کمشنر بہادر کے یہاں تو وہ ہنسکر بولے۔ دل خانصاحب گورنمنٹ تم کو بہت عزت دے گا اور ہم تم کو جلد خان بہادر بنادونگا۔ تو حضرت پھر تو من میری خدمات میں اور سرگرمی پیدا ہو گئی رنگروٹوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

انجھ کو عرض کیا: "مختصر یہ کہ آپ خان بہادر ہو گئے اور او۔ بی۔ ای ہوتے ہوتے بچے یہ تو درست مگر ——"

بات کاٹ کر بولے: "میاں پوری بات تو سنو میری۔ اب جناب سال میں دو مرتبہ خطابوں کی فہرست نکلا کرتی تھی اور ہر مرتبہ خان بہادری کا انتظار رہتا تھا مگر نہ آج خطاب آتا ہے نہ کل۔ دل نے کہا کہ بس ہو چکے جو کچھ ہونا تھا اور اب بیچ چکے ہیں مسٹر ڈارلنگ کے۔ نتیجہ یہ میں نے بھی رنگروٹوں کی بھرتی کا کام چھوڑ دیا۔ آخر ایک دن مسٹر ڈارلنگ نے اپنا خاص سنتری بھیجا جناب وہ سرخ وردی پر جگمگاتی پیٹی لگائے میرے میاں آیا اور کہا کہ صاحب نے یاد کیا ہے تو جناب اسی روز میں شام کو گیا۔ ڈارلنگ صاحب کے بنگلہ پہ ڈارلنگ صاحب بہت ہی محبت سے ملے۔ ہاتھ ملایا۔

سگریٹ پلائی خاص اپنے سگریٹ کیس سے اور مجھ سے کہا کہ خانصاحب آپ بہت جلد گھبرا گیا ہے آپ خان بہادر ضرور ہو گا۔ مگر اپنا کام نہ چھوڑیئے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ کہ جیسی حضور کی رائے ہو یہ غلام تو بندہ بے دام ہے۔"

اب بتایئے کوئی کہاں تک یہ مکروہ داستان سُنے پھر تنگ آ کر عرض کیا:۔ "خان بہادر صاحب وہ تو میں سمجھ گیا مگر حضور اب تو اپنی حکومت ہے اب یہ لفظی فریب کاریاں۔ یہ اعتباری عزتیں"

پھر بات کاٹ کر بولے لاحول ولا قوۃ صاحب بات تو سُنیئے میری تو جناب میں نے پھر بھرتی کا کام شروع کر دیا۔ اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک مرتبہ رنگروٹوں کی تعداد ہمیشہ سے زیادہ رہی اور اب جو یکم جنوری آتی ہے تو ۳۱ ر دسمبر کی رات ہی کو خان بہادری کا تار آ گیا۔"

عرض کیا:۔ خیر وہ تو خدا آپ کو مبارک کرے۔ مگر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اب آپ کس کی خوشامد کریں گے اب آپ کو کون یہ جھوٹے خطاب دیکر عزت کا فریب دیگا۔ اب تو دستِ خود دہانِ خود والا معاملہ ہے۔ بقول شخصے

"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ"

گردن کو جھٹکا دے کر بولے:۔ جی نہیں بندہ نواز یہ خاکسار اس کا قائل نہیں ہو سکتا۔ خطابوں کو بند کیا تھا تو اپنے خطاب جاری کئے ہوتے۔ بلکہ میں نے تو ایک اسکیم بنائی تھی کراچی بھیجنے کے لئے کہ انگریزی دور کے خطابات اگر مسترد

کہہ دیئے گئے ہیں نواب پاکستانی خطاب وضع کئے جائیں مثلاً خان صاحب کے بجائے پاک صاحب، خان بہادر کی جگہ پاک بہادر، شمس العلماء کی جگہ علامۂ دہر مختصر یہ کہ اسی قسم کے تمام خطاب ہیں نے تجویز کئے تھے بلکہ یہ بھی لکھا ہے اپنی اس اسکیم میں کہ خطاب کیوں ضروری ہیں۔ اسے بھی ایک چاٹ ہوتی ہے ان خطابوں کی۔ آخر آدمی کس امید پر کوئی کام کرے۔"

عرض کیا:۔ "اپنا کام کوئی کس امید پر کرتا ہے بےلوث خدمت بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔"

خان بہادر صاحب بگڑ کر بولے:۔ "پھر وہی۔ میاں میں یہ پوچھتا ہوں کہ فرض کرلو آج یوم پاکستان ہے اگر آج دوسری تقریبات کے علاوہ گورنر صاحب کا دربار بھی ہوتا اور اس دربار میں خطابات۔ تمغے۔ سندیں۔ تلواریں اور جاگیریں عطا ہوتیں تو اس دن کی ایک اہمیت بھی ہوتی۔ ایک آسرا تو ہوتا لوگوں کو کہ اگر ملک اور قوم کا کام کریں گے تو یوں عزت افزائی ہو سکتی ہے۔ مگر اب تو ایک لاٹھی ہے سب ہی بھینسیں ہنکائی جا رہی ہیں۔"

عرض کیا:۔ "خان بہادر صاحب بات یہ ہے کہ نہ میں آپ کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بےلوث خدمت کرنے والے کو خود اس کا دل اور اس کا ضمیر کتنا بڑا صلہ دیتا ہے۔ آپ عادی ہیں اس دور کے جب انگریز آپ کو خان صاحب اور خان بہادر بنا کر اکبر الہ آبادی سے یہ شعر کہلواتے تھے کہ

اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

خان بہادر صاحب نے جلبلا کر اٹھتے ہوئے کہا: "ہاں صاحب بات تو واقعی یہی ہے کہ نہ آپ مجھ کو قائل کر سکتے ہیں نہ میں آپ کو۔ مگر بندہ اس خیالی مولی جشنِ آزادی کا قیامت تک قائل نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔"

خان بہادر صاحب اسی طرح بڑبڑاتے ہوئے تشریف لے گئے اور وہ راقم میں یہ الجھن چھوڑ گئے کہ کیا واقعی ہمارے افراد اب تک ملک قوم کی بے لوث خدمت پر اس اعتباری عزت کو ترجیح دیتے ہیں جو عزت سے زیادہ حماقت کے ذیل میں آتی ہے۔

بوہنی میں السیٹ

آپ کا ایسا ہی بُرا بھلا کہنے کو جی چاہتا ہے تو آپ زیادہ سے زیادہ مجھ کو شاعر کہہ سکتے ہیں مگر مشاعرہ میں ہرگز نہیں ہوں۔ اور اگر آپ انصاف سے کام لیں تو یہ واقعی زیادتی ہے کہ ایک فردِ واحد کو پورا مشاعرہ سمجھ لیا جائے۔ مگر مجھ بدنصیب پر یہ زیادتی ہو چکی ہے جس کی داستان ذرا تفصیل طلب ہے۔

جھوٹ کیوں کہوں شاعر تو خیر میں ہوں۔ بھئی شاعر ہونا اسی کو کہتے ہیں نا کہ انسان کا ایک تخلّص ہو۔ وہ شعر کہتا ہو۔ کہہ کر پڑھتا ہو اور اگر زیادہ شامت آ جائے تو چھپواتا بھی ہو۔ مجھ کو اپنی تمام کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ تخلص بھی ہے، نظمیں اور غزلیں بھی کہتا ہوں مشاعروں میں شرکت بھی کرتا ہوں اور اپنا کلام رسالوں اور اخباروں میں چھپواتا بھی ہوں مگر اس کے باوجود مجھ کو زیادہ سے زیادہ آپ شاعر ہی تو کہہ سکتے ہیں میں مشاعرہ کیونکر ہو سکتا ہوں مگر قسمت میں یہ بھی لکھا تھا، میں صرف شاعر نہیں بلکہ مشاعرہ بن کر رہوں چنانچہ قسمت کے لکھے کو میں نہ مٹا سکا۔

جُرم صرف یہ ہُوا کہ اپنے چند معاصرین کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ایک مشاعرے

کے دعوت نامے کے جواب میں لکھ دیا کہ مجھ کو شرکت میں کوئی عذر نہیں مگر میں مشاعرہ کمیٹی سے اتنی رقم وصول کروں گا۔ ظاہر ہے کہ یا تو آدمی اس قسم کی ادبی محافل میں شرکت کی کوئی فیس ہی نہ لے اور اگر لینا ہی ہے تو پھر اپنے شایانِ شان لے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ عام آدمی عموماً اور شاعر خصوصاً اپنی قیمت کا کچھ زیادہ ہی تخمینہ لگاتے ہیں چنانچہ یہی ہوا کہ مشاعرہ کمیٹی نے میرے مطالبہ کو بظاہر اپنی حیثیت اور اصل میں میری اوقات سے زیادہ سمجھ کر مجھ کو لکھا کہ یہ بہت زیادہ ہے اس میں تخفیف فرمائی جائے۔ اس قسم کے موقعوں پر خود دار آدمی عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اگر مول تول کرے تو شاعری اور ترکاری میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا اور اگر راضی برضا ہو جائے تو معاملہ وہ ملتا ہے جس کی رسید دینے سے تو مر جانا ہی بہتر ہے۔ اس صورت میں اب اپنے مطالبے سے نیچے اترنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا خواہ مشاعرے کی شرکت سے محروم ہی کیوں نہ رہنا پڑتا۔ لہذا جواب میں ذرا سختی سے لکھ دیا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ شاعر سے دام چکا رہے ہیں۔ اس "فرش نشین" مگر "عرش نشیمن" کو نیلام پر چڑھائے ہوئے ہیں۔ اگر مطلوبہ رقم پیش کرنے سے آپ قاصر ہیں تو یہ خاکسار بھی شرکتِ مشاعرہ سے معذور ہے۔

زندگی میں پہلی مرتبہ تو مشاعرے کو ذریعۂ معاش بنانے کا ارادہ کیا اور اس میں بھی مول تول شروع ہو گیا۔ سبحان اللہ! اس کو کہتے ہیں "بوہنی میں السیٹ"۔

خیر وہ کچھ بھی ہو مگر یہ تو نہیں ہو سکتا کہ نیلامی بولیاں کوئی اپنے اوپر شروع کرا دے۔ شرکتِ مشاعرہ سے انکار کر کے مشاعرے کی طرف سے ایک آدھ دن ہیں صبر آ ہی گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ صبر آخر آ ہی جاتا ہے اور وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ مگر اس سے زیادہ سچی بات کسی نے یہ کہی ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، یعنی قطعی غیر متوقع طور پر اس مشاعرے کے سیکرٹری صاحب کا پھر ایک گرامی نامہ موصول ہوا کہ "مشاعرہ کمیٹی نے آپ کے والا نامہ پر غور کرنے کے لئے ایک خصوصی اجلاس طلب کیا اور گرما گرم مباحثہ کے بعد آخر کار طے یہ ہوا کہ آپ کا مطالبہ منظور کر لیا جائے۔ چنانچہ گذارش یہ ہے کہ اب آپ مقررہ تاریخ پر پہنچنے کے لئے صبح کی ٹرین سے روانہ ہو جائیں تاکہ شام کو یہاں پہنچ سکیں اور آپ کا استقبال آپ کے شایانِ شان ہو سکے۔"

کیوں صاحب ان حالات میں اگر یہ خط آپ کے پاس آتا تو کیا آپ کو اپنی اہمیت کا احساس نہ ہوتا اور کیا آپ غور نہ کرتے کہ صرف آپ کے ایک خط پر غور کرنے کیلئے ایک عظیم الشان مشاعرے کی مشاعرہ کمیٹی کا اجلاس خصوصی طلب کیا گیا اور اس میں گرما گرم مباحثہ ہوا اور فیصلہ آپ ہی کے حق میں ہوا۔ پھر یہ کہ آپ کے شایانِ شان استقبال ایک کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ آپ یقیناً اس خط کو بار بار پڑھتے جیسا کہ میں نے پڑھا اور ایک ایک لفظ کے معنی نکالتے جس طرح میں نے نکالے اور آخر اس استقبال کے شایانِ شان اپنے کو بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کہ سیاہ

شیروانی پر سفید ہار کے سفید پھول خوب کھلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ٹرین سے اُترتے ہی مشاعرہ کمیٹی کے لوگ استقبال کی ابتدا ہار پہنا کر کریں گے اور فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے تصویریں بھی لیں گے۔ ان تصاویر میں سیاہ شیروانی اور اس پر ہاروں کے سفید پھول پھوٹ نکلیں گے پھر شیروانی تو تصویر کو سجا دیتی ہے بشرطیکہ چوڑی دار پاجامہ کسی موچی نے نہیں بلکہ کسی باقاعدہ درزی نے سیا ہو۔ شیروانی بغیر چوڑی دار پاجامہ کے سہاگن نہیں معلوم ہوتی اور چوڑی دار پاجامہ بغیر پھل دار موزوں اور وارنش کے پمپ کے کچھ بندوق کا غلاف بن کر رہ جاتا ہے۔ لطف آجائے اگر اس لباس پر ایک اعلیٰ درجہ کی جناح کیپ بھی ہو۔ اس تمام سامان کا تخمینہ ذرا حوصلہ شکن ضرور تھا مگر مشاعرہ کمیٹی سے جو رقم طے ہوئی تھی اس میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ یہ تمام سامان خریدنے میں پوری ریاضت سے کام لیا گیا اور درزی کو ہدایت کر دی کہ اُجرت کا کوئی سوال نہیں البتہ شیروانی ایسی ہو کہ مشاعرہ لوٹ لائے اور چوڑی دار پاجامہ بھی ایسا ہو کہ حاصلِ مشاعرہ سمجھا جائے۔ کُرتہ آپ کی دُعا سے موجود تھا جو اسی قسم کی تقریبات کے لئے تبرک کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ اس کُرتے پر جو بیل کڑھی ہوئی ہے اس کے پھولوں کو اکثر لوگ دھوکہ کھا کر سونگھ لیا کرتے ہیں ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں اسی کُرتے کی سب سے زیادہ فکر تھی اور شکر ہے کہ یہ کُرتہ مع اپنے گریبان کے اگست ۱۹۴۷ء کے دستِ وحشت سے صاف بچ گیا۔ اس کُرتے کے نیچے جالی دار بنیان کچھ ایسا منظر پیش کرتی

ہے گویا جمنا کے اندر تاج محل کا عکس پڑ رہا ہو۔ مگر معاف کیجیے گا یہ ایک غیر ملکی قسم کا استعارہ ہے۔ استعارہ بھی نہیں بلکہ غیر ملکی تشبیہ ہے۔ تو اب اس کو یوں سمجھئے کہ اس کرتے کے نیچے جالی دار بنیان ایسی معلوم ہوتی ہے گویا سمندر میں کلفٹن جھانک رہا ہو۔ مگر ان چیزوں کے علاوہ سفر کے لئے اور ایسے سفر کے لئے جس کا اختتام عظیم الشان استقبال پر ہونے والا ہو بے شمار چیزوں کی ضرورت تھی۔ مثلاً ایک اعلیٰ درجہ کا سوٹ کیس ہونا چاہیئے تھا خیر وہ تو بیگم صاحبہ نے کہا کہ میں نیلے بھائی جان سے منگا دوں گی۔ بستر کے لئے ہولڈال تو خیر موجود تھا مگر اس کے تسمے گھوڑے تانگے کا کھیل کھیلتے ہوئے بچے اپنے صرف میں لا چکے تھے لہٰذا وہ بھی خریدے گئے۔ اب رہ گیا بستر کا سامان، اس سلسلہ میں آپ کو یہ سُنکر مسرت ہوگی کہ آپ کا یہ غلام بے حد خوش قسمت واقع ہوا ہے۔ بستر کی سب سے بڑی چیز ہے لحاف۔ وہ بیگم صاحبہ کے جہیز میں آیا تھا اور اگر انکسار سے کام نہ لیا جائے تو وہ دراصل اس قابل ہے کہ فریم کرا کے گول کمرے میں لگا دیا جائے۔ یہ لحاف عام طور پر ایک بڑے سے صندوق میں بند رہتا ہے اور اس کو استعمال کرنے کے لئے اس خاکسار کو انتظار ہے کسی ایسے وقت کا جب اس کارساز کی قدرتِ کاملہ کسی ملک کی فرمانروائی عطا کرے گی تو شاہی چھپر کھٹ پر یہ لحاف زیب دیگا۔ مگر اس مشاعرے کے لئے بیگم نے اس لحاف کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی۔ پھر گھر بھر کے تکیے جمع کئے گئے اور ان کا طبی معائنہ شروع

ہُوا کہ ان میں سے وہ کونسے دو تکیئے ہیں جو کم سے کم مرمت کے بعد بادی النظر میں تکیئے سمجھے جا سکیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں بلوہ ہو گیا ہے اور یہ تکیئے نہیں بلکہ اس بلوے کے زخمی یہاں لا کر تلے اوپر ڈھیر کر دیئے گئے ہیں۔ بمشکل تمام دو تکیئے زیر انتخاب کام کرنے اور طے پایا کہ تکیہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں تکیئے کو تو اس کا غلاف سمجھا جاتا ہے اور غلاف خدا کے فضل سے ایسے ایسے ہمارے یہاں موجود ہیں کہ لوگوں کو چاہیئے کہ دُور دُور سے دیکھنے کو آئیں۔ اور سیاحوں کی نظر پڑے تو تصویریں اُتار لے جائیں چنانچہ ان دو تکیوں کے لئے جو دو غلاف نکالے گئے ان میں سے ایک پر لوٹے نیلے۔ پیلے ریشم سے کڑھا ہُوا تھا WELCOME اور دوسرے پر ایک ایسی چڑیا کی دیدہ زیب تصویر تھی جس کو دیکھ کر علم حیوانات کے ماہر حیران ہیں کہ یہ آخر کس نسل کی چڑیا ہے اور دُنیا کے کس حصّے میں پائی جاتی ہے۔ بستر کی چادر البتہ کوئی ایسی نہ تھی جو ایسے تکیوں اور ایسے لحاف کے ساتھ سج سکے متعدد بکس ٹٹولنے کے بعد ایک خوبصورت چادر مل تو گئی مگر اس میں یہ نقص نکل آیا کہ اس کے کناروں پر چاروں طرف عجیب عجیب مصرعے چھپے ہوئے تھے۔ مثلاً۔

"روزی خود میخورد برخوانِ تو"

ظاہر ہے کہ ایسی چادر ساتھ لے جانے سے تو یہی اچھا تھا کہ بغیر بستر کے پہنچ جاتے۔ مگر وہ رہی منتظم بیوی۔ دروازے کا ایک پردہ اُتار کر اس کے گوشے نکال دیئے اور اب جناب وہ ایسی لاجواب چادر بنی ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔ خدا معلوم کہ کسے

بستر اور سوٹ کیس کا سامان مکمل ہو گیا اور اب اس سفر کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت تھی ایک ذرا خوبصورت سا لوٹا دوسرے ذرا مناسب سی سلیپر۔ لوٹوں کے سلسلہ کی مجبوری یہ تھی کہ جو لوٹے صورت شکل کے اعتبار سے درست تھے وہ ٹپکتے تھے اور ایک لوٹا جو ٹپکتا نہ تھا اس کی ٹونٹی خدا جانے کس حادثہ میں ٹوٹ گئی تھی اور بیگم صاحبہ اس بات کی سخت مخالف تھیں کہ اتنے بڑے شاعر کے لئے ایک لوٹا تک کسی سے مانگا جائے۔ کافی غور و فکر کے بعد طے پایا کہ لوٹا دراصل عہدِ جہالت کی یادگار ہے اور اس روشنی اور ترقی کے دور میں بغیر لوٹے کے بھی زندگی بسر ہو سکتی ہے بلکہ وہ زندگی جو لوٹے کے ساتھ بسر ہو نہ ترقی یافتہ زندگی کہلاتی ہے نہ ترقی پسند زندگی۔ چنانچہ لوٹا تو لایا گیا تخفیف میں اور سلیپر کی جگہ بیگم صاحبہ نے مشورہ دیا کہ وہ پھولدار کھڑاویں رکھ لیں جن میں سے ایک کی کھونٹی رات سے غائب تھی مگر حال ہی میں پتہ چلا کہ شطرنج کے مہروں میں رکھی ہوئی ہے اور بادشاہ کے بجائے اس لئے استعمال ہوتی ہے کہ شاہ موصوف فقیری لے کر مدت سے مفقود الخبر ہیں۔ بہرحال وہ کھڑاویں بھی احتیاطاً رکھ لیں کہ داشتہ بکار آید۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کے لئے دن گنے جا رہے تھے۔ گھڑی میں آدھی رات کا آلارم لگا کر سوئے تھے مگر الارم بجنے سے پہلے ہی بیدار ہو کر الارم کو بجنے کی زحمت سے بچا لیا۔ راتوں رات نہا دھو کر پیج بن کر تیار ہو گئے اور صبح ہوتے ہی گھر سے اپنا سامان اور بیوی کی دعائیں لے کر اسٹیشن روانہ ہو گئے جب منزلِ مقصود

پر شاندار استقبال ہونے والا ہو تو راستہ خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے اور وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ ہر چند کہ اپنے نزدیک ٹرین میں سوئے بھی۔ مشاعرے میں جو غزل پڑھنے والے تھے اس پر بار بار نظر ثانی کی۔ اس کی دھن بٹھائی۔ کئی مرتبہ غسل خانہ میں جا کر آئینہ کے سامنے وہ غزل پڑھ پڑھ کر اپنے کو سنائی۔ داد پر سلام کرنے کے طریقوں کا ریہرسل کیا اور آخر جب منزلِ مقصود قریب آئی تو سوٹ کیس سے برش نکال کر پہلے سیاہ شیروانی کو صاف کیا پھر وارنش کے پمپ کو چمکایا چوڑی دار پاجامے کی چوڑیاں مرتب کیں۔ ہاتھ منہ دھو کر بال بنائے۔ جناح کیپ کے زاویے درست کئے۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آگیا جس پر شعر و ادب کے ایک دیرینہ خدمت گذار کو اس کی خدمات کا صلہ ملنے والا تھا۔ شوق نے کہا مار چھلانگ پلیٹ فارم پر۔ ضبط نے کہا خیر مقدم کرنے والوں کو آنے دو۔ یہی وقت ہے رکھ رکھاؤ کا۔ چنانچہ ایک اخبار لے کر بیٹھ گئے جو اس وقت کسی ایسی زبان کا اخبار معلوم ہو رہا تھا جس کے گویا حرف شناس ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ انجن نے روانگی کی سیٹی دیدی اور اب اس رکھ رکھاؤ کو اٹھانا ہی پڑا۔ ہولڈال پلیٹ فارم پر پھینکا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لیا اور پلیٹ فارم پر آگئے۔ جہاں حدِ نظر تک نہ اس عظیم الشان مشاعرے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے۔ نہ پھولوں کے ہار لئے ہوئے مشاعرے کے رضا کار نہ فوٹو گرافر۔ اخبار پر تاریخ دیکھی کہ کہیں مارے شوق کے ایک دن پہلے تو نہیں آگئے۔ اسٹیشن کا نام پڑھا کہ کہیں غلط جگہ تو نہیں اتر گئے اور جب ہر طرح سے

اطمینان کر لیا تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک صاحبزادے نے قریب آ کر کچھ سونگھنے کے انداز سے کہا:۔

"جناب لاہور سے تشریف لاتے ہیں؟"

عرض کیا:۔ "جی ہاں۔ حاضر تو ہوا ہوں لاہور سے یہاں ایک مشاعرہ ہے" وہ بات کاٹ کر جلدی سے بولے "اوہو ہیں تو آپ کو بڑی دیر سے ڈھونڈھ رہا تھا اور اب تو مایوس ہو چلا تھا۔ بہرحال تشریف لائیے" اور ایک قلی سے ارشاد فرمایا کہ سامان اٹھائیے۔

اسٹیشن سے جائے قیام تک ایک ایسے تانگے پر لائے گئے جس کا گھوڑا غالباً سودا کے گھوڑے کی نسل کا چشم و چراغ تھا اور ٹھہرائے گئے ایک ایسے خانۂ بے تکلف میں جو تھانوی کی رعایت سے کچھ تھان کی سی حیثیت رکھتا تھا ہم تو دم بخود تھے مگر وہ سودا کے گھوڑے کی نسل کا گھوڑا فرطِ مسرت سے ہنہنا رہا تھا۔ اسٹیشن پر جس سناٹے کے ساتھ خیر مقدم ہوا تھا اس کے معنی یہ پیدا کئے تھے کہ اسٹیشن پر استقبال مناسب نہ سمجھا گیا ہوگا اور طے ہوا ہوگا کہ جائے قیام پر گارڈ آف آنر کا معائنہ کرایا جائے۔ مگر یہاں بھی ایسی ویرانی سی ویرانی تھی کہ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آ رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ایک صاحب دانت نکالے اور ناک ضبط کئے ہوئے تشریف لائے۔

"آداب عرض۔ تشریف لائیے ——— بڑی لیٹ ہو گئی آج گاڑی" کاش ان حضرت کو معلوم ہوتا کہ گاڑی سے زیادہ وہ تانگہ لیٹ ہوا تھا جس کا گھوڑا عروجِ

کی پابندی کے ساتھ ہر قدم ناپ تول کر اٹھاتا تھا۔ ان حضرت نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا: "میری رائے میں مشاعرے کے بعد ہی طعام کا بندوبست کیا جائے اس لئے کہ کافی دیر ہو چکی ہے۔"

عرض کیا: "جی ہاں یہی مناسب ہوگا۔"

وہ حضرت بولے: "یہ دہاں شاہ دس قدم پر تو ہے ہی تشریف لائیے!"

آگے آگے وہ حضرت اور پیچھے پیچھے یہ خاکسار۔ اس گلی میں داخل ہو کر اس گلی میں برآمد ہوئے اور اس گلی سے مڑ کر پھر ایک گلیارے میں پہنچے یہاں تک کہ گلیاں بھی ختم ہو گئیں اور ایک سپاٹ میدان شروع ہو گیا۔ جس کے ایک گوشے میں کچھ شامیانہ سا نظر آیا۔ کچھ روشنی بھی تھی اور زندگی کے کچھ ایسے آثار تھے جیسے کسی جنازے کی آمد پر قبرستان میں نظر آتے ہیں۔ ابھی ہم لوگ دس پانچ قدم ادھر ہی تھے کہ ایک صاحب نے لپک کر ہمارے رہنما سے پوچھا: "کیوں بھئی آ گئے وہ حضرت یا لعنت بھیجی جائے؟"

رہنما نے انگشتِ شہادت لبوں پر رکھ کر آنکھ سے کچھ ایسا اشارہ کیا کہ وہ حضرت کچھ ٹھٹک کر رہ گئے اور نہایت منافقت سے فرشِ راہ ہوتے ہوئے بولے "تشریف لائیے حضور بڑا انتظار کرایا آپ نے۔ غالباً ٹرین کافی لیٹ تھی۔" اور حضور جی ہاں۔ اور جی نہیں قسم کے داخلی جواب دیتے ہوئے پنڈال میں پہنچ گئے جہاں کسی کے اشارے پر پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ تالیاں اس کس مپرسی کے عالم میں

بڑی تکلیف محسوس ہوئی اور وہ احساس کمتری جو خودکشی کی طرف متوجہ کر رہا تھا ان تالیوں میں دب سا گیا۔ ابھی پنڈال تالیوں سے گونج ہی رہا تھا کہ ایک تیلا لال سا نوجوان مائیکروفون کے قریب جا کر حاضرین کو مخاطب کیا:۔

"حضرات۔ ہمیں افسوس ہے کہ ٹرین کے اتفاقاً لیٹ ہو جانے کی وجہ سے ہمارے مہمانِ محترم دیر سے پہنچے اور آپ کو انتظار کی صبر آزما گھڑیاں گذارنا پڑیں۔ حضرات اگر یہ عام مشاعرہ ہوتا تو آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے ہم دوسرے شعرا کو پیش کرتے رہتے اور یہ وقت کشمکشِ انتظار میں یوں نہ کٹتا۔ مگر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ مشاعرہ قائدِ اعظم میموریل فنڈ کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ ارادہ یہ تھا کہ اس کی کل آمدنی اخراجات منہا کر کے اسی فنڈ میں دیدی جائے گی۔ ہم نے اس مشاعرے کے لئے شعرا کی اچھی خاصی فہرست بنائی تھی مگر باوجود اس کے کہ ہم نے متعدد خطوط لکھ کر اپنے ان مہمانِ محترم کو جو تشریف لائے ہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مقصدی مشاعرے کی شرکت میں تجارتی لین دین سے کام نہ لیں۔ موصوف اپنے گراں قدر مطالبے سے قطعاً نیچے نہ اترے اور آخر ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ آپ کی منہ مانگی رقم آپ کو پیش کر دی جائے خواہ کسی اور شاعر کو ہم نہ بلا سکیں"

"پھر سے پنڈال سے نعرہ بلند ہوا۔ "شرم۔ شرم""

اور ہم نے محسوس کیا کہ ہم کچھ ڈوبے سے رہے ہیں۔ مقرر کی تقریر جاری تھی۔

"حضرات ہمارا اور آپکا فرض اب یہ ہے کہ اپنے مہمانِ محترم پر قناعت کریں اور

پورا وقت آپ ہی کو دے کہ آپ کا کلام ذرا تفصیل سے سنیں۔

ہم کو محسوس ہوا گویا ہم مشاعرے میں نہیں بلکہ ہوائی جہاز پر سفر کر رہے ہیں اور جہاز اس وقت بادلوں کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ اسی وقت خدا جانے کس بزرگ نے سہارا دے کر ہم کو مائیکروفون کے قریب لا کھڑا کیا اور ہم نے بہت کچھ سنبھل کر ایک غزل شروع کی جس کا پہلا مصرعہ اسی غزل کا تھا جو ہم پڑھنا چاہتے تھے مگر دوسرا مصرعہ اس غزل کا تھا جو ہم پڑھنا چاہتے تھے یعنی دوسرا مصرعہ اُس غزل کا تھا جو خدا جانے اِس وقت کیوں یاد آگئی تھی۔ پنڈال قہقہوں اور تالیوں سے گونج رہا تھا۔ معلوم نہیں کس خدا ترس کو ہم پر رحم آیا اور ہمارے سامنے پانی کا گلاس پیش کیا گیا۔ اس عرصہ میں سیکرٹری صاحب مشاعرہ نے سامعین کو شرافت کے چند درس دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ چپ ہو گئے اور پانی پینے کے بعد ہم نے بجائے غزل پڑھنے کے اعلان کیا:۔

حضرات! میں نے توبہ کر لی ہے۔ کہ اوّل تو آئندہ مشاعروں میں شرکت ہی سے احتراز کیا کروں گا۔ اور اگر بفرضِ محال کہیں شریک بھی ہونا پڑا تو بجائے معاوضہ لینے کے بانیانِ مشاعرہ کو معاوضہ پیش کیا کروں گا۔ اب بدقسمتی سے میں گھر سے سوائے سفر خرچ کے مزید رقم ہمراہ نہیں لایا۔ اس لئے میری یہ پیشکش صرف اس حد تک محدود رہیگی کہ واپسی کا کرایہ رکھ کر وہ تمام رقم جو مجھے سیکرٹری صاحب کی طرف سے ملنے والی ہے۔ اُسے میں قائد اعظم میموریل فنڈ میں بہ صد خلوص پیش کر دوں۔

کسی غزل پر مجھ کو کبھی اتنی داد نہ ملی تھی جتنی اس اعلان پر ملی اور پھر جو غزل بھی پڑھی مقبول ہوتی گئی

کرکٹ میچ

بعض دوستوں نے سیالکوٹ چلنے کو کہا تو ہم فوراً تیار ہو گئے مگر جب یہ معلوم ہوا کہ اس سفر کا مقصد کرکٹ میچ دیکھنا ہے تو یکایک جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سفر کا تمام ولولہ ایک بیتی ہوئی یاد کی نذر ہو کر رہ گیا۔ اب لاکھ لاکھ سب پوچھتے ہیں کہ چکر آ گیا ہے، فالج گرا ہے، قلب کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ آخر واقعہ کیا ہے مگر کسی کو کچھ نہ بتا سکے اس لیے کہ کوئی معمولی سی بات نہ تھی کہ سرسری طور پر بتا دی جاتی۔ اس کے لیے جس تفصیل کی ضرورت ہے، وہ اس وقت میسر نہ تھی۔ اب میسر ہونے کا امکان ہے تو عرض کیے دیتے ہیں۔

آپ گھبرائیے گا نہیں اور نہ اس کو بدحواسی سمجھئے گا کہ یہ کرکٹ کا قصہ ہے اور ہاکی سے شروع ہو رہا ہے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کو ہاکی اور کرکٹ کا فرق معلوم ہے مثلاً ہاکی کا گیند سفید ہوتا ہے اور کرکٹ کا لال اور مثلاً ——— مثلاً ——— مطلب یہ کہ مثال کے طور پر سیکڑوں فرق عرض کیے جا سکتے ہیں۔ خوب یاد آیا مثلاً کرکٹ میں رن بنائے جاتے ہیں اور ہاکی میں گول۔ ہاکی میں گول کیپر ہوتا ہے اور کرکٹ میں وکٹ کیپر۔ مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ زمین آسمان کا فرق ہے ان دونوں کھیلوں میں اور ہم کرکٹ کی داستان جو ہاکی سے شروع کر رہے ہیں اس کا خدانخواستہ یہ مطلب نہیں ہے کہ اب ہم اٹھتے ہی گویا گڑبڑا دی ہیں۔

کہ ہاکی کو کرکٹ یا کرکٹ کو ہاکی سمجھتے ہیں بلکہ کرکٹ کی داستان ہاکی سے شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا قصہ اصل میں ہاکی ہی سے شروع ہوتا ہے۔

اسکول کے زمانے میں ہم ہاکی کھیلا کرتے تھے اور کچھ اچھا ہی کھیلتے تھے کہ ہم کو اسکول کی اس ٹیم میں لے لیا گیا تھا جو ٹورنامنٹ کھیلنے والی تھی۔ چنانچہ ہم ٹورنامنٹ کے میچوں میں کھیلے اور خوش قسمتی سے ہماری ٹیم فائنل میں بھی پہنچ گئی۔ پہنچ کیا گئی بلکہ جیت ہی جاتی اگر ہماری نظریں عین اس وقت جب کہ ہم آسانی سے گول بچا سکتے تھے تماشائیوں میں والد صاحب پر نہ پڑ جاتیں جو آئے تو تھے میچ دیکھنے مگر آنکھیں بند کئے کچھ بڑبڑا رہے تھے اور کچھ عجیب رقت انگیز چہرہ بنا ہوا تھا ان کا۔ ہم نے ان کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہا کہ یہ آج کہاں آ گئے اور وہاں شور ہوا گول ہو جانے کا۔ اس شور سے ہم بھی چونکے اور والد صاحب نے بھی آنکھیں کھول دیں اور کچھ ایسی قہر آلود نگاہوں سے دیکھا ہم کو کہ ہاکی سے طبیعت اچاٹ کر کے رکھ دی۔ اب ہماری ٹیم لاکھ لاکھ زور لگاتی ہے گول اتارنے کیلئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف کی ٹیم کے کسی کھلاڑی کے والد صاحب تماشائیوں میں تھے ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ کھیل ختم ہو گیا اور ہماری ٹیم ہار گئی اب جس کو دیکھئے وہ ہم ہی کو اس ہار کا ذمہ دار ٹھہرا رہا ہے۔

”بھئی یہ ہوا کیا تھا۔ سو گئے تھے کیا؟“

”کمال کر دیا تم نے گیند ٹہلتا ہوا تمہارے سامنے سے گول میں چلا گیا اور تم منہ اٹھائے کھڑے رہے۔ حد کر دی تم نے بھی۔“

"ہارنے کا افسوس نہیں ہے مگر یہ تو مفت کی ہار ہوئی"

تماشائیوں میں سے ایک صاحب کہتے ہوئے نکل گئے "رشوت میں افیم ملی تھی کھلانے کو گولی کھائی گولی کر الیا"

اب کسی کو ہم کیا بتاتے کہ ہم پر کیا قیامت گذر رہی تھی۔ اس وقت لعنتیں برستی رہیں ہم پر۔ اور ہم سر جھکائے سب کچھ سنا کئے اس لئے کہ واقعی قصور اپنا ہی تھا۔ دوسرے اس لعنت ملامت کی پرواکس کو تھی۔ دل تو اس وقت کچھ تصور سے دھڑک رہا تھا جب گھر پہنچکر والد صاحب کے سامنے پیشی ہوگی۔ بمشکل تمام اس مجمع سے جان بچاکر نکلے ہائے گھر جو پہنچے تو ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی والد صاحب کی گرجدار آواز سنائی دی۔

"مگر میں پوچھتا ہوں کہ مجھے آجتک کیوں نہ معلوم ہوا کہ صاحبزادے کو خود کشی کا یہ شوق بھی ہے تم تو یہ کہہ کر چھٹی پاگئیں کہ یہی ہوتا ہے کھیل کود کا زمانہ"

والدہ صاحبہ نے فرمایا "تو کیا غلط کہا میں نے کس کے بچے نہیں کھیلتے"

والد صاحب نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا "پھر وہی کھیل۔ اے جناب یہ موت کا کھیل ہوتا ہے موت کا۔ گولیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے ہر طرف اور خدا ہی کھیلنے والوں کو بچاتا ہے۔ میر اصغر علی کا نوجوان لڑکا ہائے کیا تندرستی تھی اس کی۔ اسی کھیل کی نذر ہوگیا۔ کلیجہ پر وہ پتھر کا پتھر گیند لگا سانس بھی نہ لی اور جان دیدی۔ باپ نے بڑھ کر پیشانی کو بوسہ دیا اور آجتک کلیجہ پکڑے پھرتے ہیں۔ اگر کچھ ہو جائے اس کے دشمنوں کو تو تمہارا کیا جائیگا میں تو ہاتھ ملتے ہوئے رہ جاؤں گا دونوں ہاتھ مل کر"

والدہ صاحبہ نے کہا "اللہ نہ کرے ایسے کلمے زبان سے بھی نکالو۔ آنے دو سمجھا دوں گی کہ یہ جان جوکھوں کے کھیل نہ کھیلا کرو۔"

والد صاحب نے کہا "مجھ احمق ہی دیر کھڑا میچ دیکھتا رہا۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگتا رہا کہ پروردگار تو ہی اس کا حافظ و ناصر ہے۔ آخر ٹاس کے دوسرے پر دوسرے پڑ رہے تھے کہ دیکھئے قسمت کیا دکھاتی ہے آج۔ ارے بھئی کھیلنے کو میں منع نہیں کرتا۔ شطرنج کھیلے۔ پچیسی کھیلے پروں کے گیند سے ایک کھیل کھیلا جاتا ہے بھلا سا نام ہے اس کا وہ کھیلے۔ ٹینس تک غنیمت ہے مگر یہ تو ایسا نامراد کھیل ہے کہ میر اصغر علی کلیجہ پکڑ کر رہ گئے تھے۔"

والدہ صاحبہ نے وہم میں مبتلا ہو کر کہا "ہو گا بھی۔ دور پار مدعی۔ اب بار بار میر اصغر علی موئے کا ذکر کیوں ہو رہا ہے کہہ تو چکی ہوں کہ سمجھا دوں گی۔"

والد صاحب نے فیصلہ کن انداز سے کہا "ہیں طے کر رہا تھا کہ علیگڈھ بھیجدوں گا اس کو۔ مگر اب تو جب تک مجھے پوری طرح یقین نہ ہو جائے کہ صاحبزادے کا ان خطرناک مشاغل سے کوئی تعلق نہیں ہے اس وقت تک ناممکن ہے میرے لئے ان کو علیگڈھ بھیجنا۔"

ہم نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ تو غضب ہو گیا۔ یہاں اسی امید پر جی رہے ہیں کہ اب علیگڈھ جائیں گے۔ ہوسٹل میں رہیں گے۔ کالج میں پڑھیں گے اور صحیح طالب علمانہ زندگی کا لطف تو اب آئیگا۔ اور وہاں اس ہاکی نے خدا سمجھے اس نامراد نے اس امید پر پانی پھیر کر رکھدیا۔ اب ڈیوڑھی میں کھڑا رہنا ناممکن بن گیا۔ ہمت کر کے قدم اٹھایا اور اس طرح والد صاحب کے سامنے ایک دم سے آ گئے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ والد صاحب تو انتظار میں بیٹھے ہی تھے دیکھتے ہی مخاطب کیا۔

"میاں ذرا بات تو سنو۔ یہ ہاکی کب سے شروع کی ہے؟"

عرض کیا "جی ہاکی؟ ہاکی سے تو دل کھٹا ہو گیا آج۔ اب کبھی جو کھیلوں میں یہ خطرناک کھیل۔ امی جان مجھے بھلا کیا معلوم تھا کہ ایسا خطرناک ہوتا ہے یہ کھیل۔ میں نے تو آج سے کان پکڑ لئے بلکہ آج تو یہاں تک ہوا کہ ایک مرتبہ گیند میرے قریب خود بخود آ گیا کہ تم میرے پاس نہیں آتے تو میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ مگر میں نے اس کو ڈر کے مارے چھوا تک نہیں۔ کہ نہ جانے کیا واردات ہو ـــــــ"

والد صاحب نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "میں تو خود حیران تھا کہ یہ تم کو ہاکی کھیلنے کی کیا سوجھی!"

عرض کیا "بیوقوفی تھی میری۔ کھیل کی وردی پہننے اور ٹیم کے ساتھ جانے کا شوق تھا۔ مگر اللہ بچائے میرا تو خون خشک ہو کر رہ گیا۔"

امی جان نے کہا "تم سے زیادہ تمہارے ابا جان اپنا خون خشک کر کے آئے ہیں۔ یہ بھی گئے تھے دیکھنے۔"

ہم نے بڑی معصومیت سے کہا "اچھا۔ آپ بھی گئے تھے۔ میں نے نہیں دیکھا۔ مگر میں تو باز آیا ایسے کھیل سے جس کو جان دینا ہو اپنی وہ کھیلے یہ کھیل۔"

والد صاحب کو سولہ آنے یقین ہو گیا کہ برخوردار ذاتی طور پر ویسے ہی بزدل واقع ہوئے ہیں جیسا وہ چاہتے ہیں اور حسب معمول علی گڑھ جانے کا پروگرام بنا رہا۔ جہاں تک ہاکی سے تائب ہونے کا قصہ ہے وہ بھی جھوٹ نہ تھا۔ ایک تو رہا ئشی حیثیت سے اس اسکول کی پہلی ٹیم میں لئے گئے تھے۔ دوسرے فائنل میچ میں مخالف سمت سے آنے والے گیند کے

سانہو جو اخلاق برت چکے تھے اس کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ پھر بھی ہم کو ٹیم میں رہنے دیا جائیگا۔ لہذا یہ تائب ہونے والی بات بھی منجانب اللہ کچھ سچ ہی ثابت ہوئی اور ہاکی سے واقعی نجات مل گئی۔ اسکول میں کچھ دن فائینل ہارنے کا یہ قصہ لطیفہ رہا اور ہم اس لطیفے کے ہیرو بنے رہے مگر اس کے بعد بات آئی گئی ہو گئی اور امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد تو ہاکی سے کیا اسکول ہی سے کوئی واسطہ نہ رہا۔

علی گڈھ میں داخلہ لینے کے بعد اس قسم کے جان جوکھوں کے کھیلوں کے علاوہ اور بھی بیشمار تفریحی مشاغل مل گئے ایسے تفریحی مشاغل کہ کالج کے باہر کی زندگی بے رونق سی محسوس ہونے لگی۔ اور کچھ ایسا دل لگا کہ حساب جو لگایا تو یہ صرف چار سال کی بہار تھی۔ حالانکہ دل یہ چاہتا تھا کہ یہ جنت اتنی بے ثبات تو ثابت نہ ہو۔ چنانچہ اس کا خود ہی انتظام کرنا پڑا۔ کہ اب ایسی بھی کیا جلدی کہ ہر سال پاس ہی ہوتے چلے جائیں اگر ہر جماعت میں صرف ایک ایک سال فیل ہوتے رہیں۔ تو آسانی سے یہ نعمت دوگنی ہو سکتی ہے۔ اور آٹھ سال تک ان دلچسپیوں کے مزے لوٹ سکتے ہیں۔ اسی پروگرام کے ماتحت ذرا اطمینان سے پڑھتے رہے۔ بعض سفر ایسے دلچسپ ہوتے ہیں اور راستے کی فضا میں مسافر کو ایسا مزہ ملتی ہیں کہ وہ میل ٹرین کے بجائے پسنجر میں سفر کرنا چاہتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی پسنجر ٹرین سے ہم نے کالج کا سفر طے کرنا شروع کر دیا کہ ہر اسٹیشن پر ٹھہر ٹھہر کر سفر کر رہے ہیں اس کے متعدد فائدے بھی پہنچے ایک تو یہ کہ وہ جو خاکساری سلسل اور متواتر پاس ہونے والوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ اور جس کے بدولت حصولِ تعلیم کا مقصد رفتہ رفتہ فوت ہو جاتا

ہے۔ الحمد للہ کہ وہ خامکاری پیدا نہ ہونے پائی اور پختگی کے علاوہ ایک عجیب ٹھوس قسم کی تجربہ کاری خود بخود پیدا ہوتی ہے اس کے علاوہ کالج کی زندگی کے وہ گوشے بھی دریافت ہوتے ہیں جو پاس ہونے والے طالب علموں کو پاس ہونے کی جنونانہ جلد بازی کے بدولت نظر ہی نہیں آتے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ جو پاس ہونے والے طالب علم ہوتے ہیں ----- ان کا کام سوائے پڑھنے کے اور کچھ ہوتا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں جب قدم رکھتے ہیں تو نہایت نامعقول ثابت ہوتے ہیں۔ ملازمت تو خیر مل جاتی ہے۔ مگر اجلاس کے کٹہرے میں اس طرح بیٹھتے ہیں جیسے طوطا اپنے پنجرے میں چنے کی دال کی کلیا پر بیٹھا کھا رہا ہو ان میں اختراع اور جدت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ نہ کسی قسم کی اپچ۔ بس لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ اور صورت سے یتیمی برستی ہے۔ برعکس ان کے وہ طالب علم جو کالج میں صرف پڑھتے ہی نہیں اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ خواہ پڑھے لکھے ثابت نہ ہوں لیکن بہت کچھ ضرور ثابت ہوتے ہیں۔ عجیب معروف زندگی ہوتی ہے۔ ان مرنجاں مرنج طالب علموں کی۔ کہیں ٹیم جا رہی ہے۔ اور وہ بھی ساتھ ہیں راستہ میں شرارتیں ہو رہی ہیں جس شہر میں ٹیم گئی ہے۔ وہاں کی سیر۔ دعوتیں۔ پھر میچ کا معرکہ۔ کالج میں ہیں تو آج یونین کے انتخابات کی سیاست کے لیڈر بنے ہوئے ہیں۔ کل کسی مشاعرے کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں۔ پرسوں یونیورسٹی پارلیمنٹ کی حزب مخالف کے رکن رکین ہیں۔ اگر کافی فیل ہوئے تو طالب علموں کے علاوہ پروفیسروں کے بھی دوست ہیں۔ جو نمبر قسم کے طالب علموں کے والدین بنے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک عجیب ہنگامہ خیز مصروفیت ہوتی ہے۔ اور زندگی تجربوں سے مالا مال ہوتی رہتی ہے۔

کچھ اسی قسم کی زندگی کالج میں اختیار کر رکھی تھی اور یہ طے تھا کہ جلد ہی کام شیطان کا ہم تو اطمینان سے ذرا سیر کرتے ہوئے کالج سے نکلیں گے اور طالب علم جو نصاب سال بھر میں گھاس کاٹنے کی طرح ختم کر دیا کرتے تھے۔ اس کو ہم دل لگا کر دو دو سال میں ختم کر دیا کرتے تھے۔ اس کو ہم دل لگا کر دو دو سال میں ختم کر رہے تھے کہ پہاڑ سر پہ یہ ٹوٹا کہ والد صاحب کی عمر دغا دے گئی اور ہم کو کالج چھوڑنا ہی پڑا۔ مگر اتنے دنوں تک کالج میں رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے شہر میں ایک قسم کی دھاک سی بیٹھ گئی۔ احباب اور اعزہ کو جب کالج کے قصے سنانے بیٹھ جاتے تو بڑا اثر ہوتا سب پر۔ ان ہی قصوں میں ایک قصہ کرکٹ کے متعلق بھی تھا کہ کالج چھوڑنے سے ہم کو تو صرف یہ نقصان پہنچا ہے کہ تعلیم ادھوری رہ گئی مگر خود کالج کو یہ نقصان پہنچا ہے کہ اب مدت تک اس کو کرکٹ کا کپتان نہ ملے گا۔

اتفاق سے یہ قصہ مقامی کرکٹ ٹیم کے کپتان صاحب کو سنا رہے تھے جن کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ کرکٹ ٹیم کے ساتھ خود اپنے خرچ سے اِدھر اُدھر جانے کا اتفاق تو ضرور ہوا تھا مگر آج تک کرکٹ کا بلا چھونے کی نوبت نہ آئی تھی مگر سوال تو یہ تھا کہ وہ ٹھہرے مقامی کرکٹ ٹیم کے کپتان ان سے آخر ہم بات کرتے تو کیا کرتے اور اتنے دنوں تک علیگڈھ میں رہنے کا رعب جماتے تو کیسے جماتے۔ ان کے نزدیک علیگڈھ کالج میں سوائے کرکٹ کھلانے کے اور کچھ گویا سکھایا ہی نہ جاتا تھا۔ دھوم تھی علیگڈھ کی کرکٹ ٹیم کی لہٰذا وہ اگر ہمارے قائل ہو سکتے تھے تو صرف اسی طرح کہ ہم اپنے کو اسی مشہور و معروف ٹیم کا کپتان ثابت کریں۔

مقامی ٹیم کے کپتان صاحب نے کہا۔ کیا بات ہے صاحب علی گڈھ کی ٹیم کی تو گویا آپ کپتان تھے اس کے ـــــ"

عرض کیا۔ "زندگی عذاب تھی صاحب آج بمبئی جا رہی ہے ٹیم تو کل دہلی اور پرسوں کلکتے۔ دو مرتبہ تو ولایت جانے کے لئے بھی اصرار ہوا بمشکل جان چھڑائی اپنی بات یہ تھی کہ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک میچ کا میچ ہوا اتفاق سے سب سے پہلے میں ہی کھیلنے گیا۔ اب جناب ہوا یہ کہ میرے علاوہ دس کے دس کھلاڑی آؤٹ ہو گئے اور میں سات سو رن بنا کر ناٹ آؤٹ واپس آیا۔"

کپتان صاحب نے گویا آؤٹ ہوتے ہوئے کہا "جی کیا کہا۔ سات سو رن ناٹ آؤٹ"

نہایت انکسار سے عرض کیا "ناٹ آؤٹ تو خیر اکثر رہا ہوں البتہ رن سب سے زیادہ ملیں بھی سات سو بنائے اس کے بعد کلکتہ میں بنائے تھے پانچسو چھیاسی رن"

وہ اور بھی حیرت سے بولے "پانچ سو چھیاسی حیرت ہے صاحب"

اور وہ اسی حیرت میں غرق چلے گئے۔ ہم کو کیا معلوم تھا کہ یہ معصوم قسم کا فنی جھوٹ رنگ لا کر رہے گا چنانچہ ایک ہفتے کے بعد وہ چار پانچ کرکٹ کے کھلاڑیوں کا ایک وفد لیکر تشریف لے آئے۔ سب سے اس خاکسار کا تعارف کرایا گیا گویا محض ہمارے بھروسے پر ٹیم ٹورنامنٹ میں داخل کر دی ہے اور طے یہ کیا ہے کہ کپتان آپ ہی رہیں گے لاکھ انکار کیا، بہت کچھ سمجھایا کہ کرکٹ چھوٹے مدت ہو چکی ہے۔ مگر تو بہ کیجئے یقین کون کرتا تھا۔ وہاں وہ حساب لگائے بیٹھے تھے کہ ہاتھی لاکھ لٹے گا۔ پھر بھی سوا لاکھ کا۔ سات سو اور پانچ سو چھیاسی رن نہ سہی ڈھائی سو تو مشق چھوٹنے پر بھی بنا ہی لیں گے مختصر یہ کہ کوئی عذر مسموع نہ ہوا اور آخر سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔

شامتِ اعمال ہماری یہ ان انگریزوں سے پڑا۔ جو سچ پوچھئے تو اس کھیل کے موجد ہیں۔ اور ان کے بولر ایسے ظالم کہ گیند کیا پھینکتے تھے گویا توپ کا گولہ پھینک رہے تھے۔ ستیاناس ہی کیا ہم لوگ جیت چکے تھے اور ہماری ٹیم کھیل رہی تھی۔ کھیل کیا رہی تھی جان ماری ہو رہی تھی۔ چار کھلاڑی آؤٹ ہو چکے تھے اور رن کل آٹھ بنے تھے۔ یہاں یہ حال کہ ایک تو اختلاج کا مرض پہلے ہی سے دوسرے نہ بھی ہوتا تو ظاہر ہے کہ علاوہ عزت آبرو کے ہمیں تو کچھ موت اور زندگی کا سوال بنا جا رہا تھا۔ اگر ان ظالموں کا گیند ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو گیا تو والد صاحب مرحوم کی رُوح سے جب عالمِ بالا میں ملاقات ہو گی تو وہ کیا کہیں گے کہ کیوں بیٹا یہی وعدہ تھا تمہارا۔ مگر سوال تو یہ تھا کہ اب کر ہی کیا سکتے تھے چھٹے کھلاڑی کے آؤٹ ہوتے ہی اب ہم کو جانا تھا۔ کلمۂ شہادت پڑھ کر لیگ گارڈ بندھوائے جس طرح دوسروں نے بیٹ سنبھالا تھا ہم نے بھی بیٹ سنبھالا اور اب جو اپنے ساتھی کھلاڑی کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں تو مجمع نے "کمپٹن اپ" کا نعرہ بلند کیا اور تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ ان تالیوں سے طائرِ روح اور بھی مائلِ پرواز ہو گیا بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی قتل کے مجرم کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے کہ جدِ اعلیٰ ایک جہاد میں گھوڑے کی پیٹھ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے ایک اور بزرگ محبت میں ناکام رہ کر دریا میں ڈوبے تھے باقی تمام افرادِ خاندان بسترِ مرگ پر موت کی کروٹ لیکر اس جہان سے اُس جہان کو سدھارے تھے مگر ہماری قسمت میں کرکٹ کی موت لکھی تھی۔ بہرحال دل کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ موت

بہرحال یوں ہی اگر کرکٹ کی راہ میں فنا ہو گئے تو اتنے تماشائی نمازِ جنازہ کیلئے مل جائیں گے لوگ تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے اور کپتان صاحب کا قلب دیا ہوا ڈھنڈوریاں مار رہا تھا۔ بمشکل تمام وکٹ تک پہنچے اور جس طرح دوسروں نے سنٹر لیا تھا ہم نے بھی اس رسم کو پورا کیا حالانکہ ہمارے ایسے کھلاڑی کیلئے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ سنٹر لے چکنے کے بعد اس دلچسپ دنیا کو ایک مرتبہ پھر حسرت بھری نظر سے دیکھا دل نے کہا۔ ع

چرچے یہی رہیں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

اب جو اس گیند پھینکنے والے ملک الموت کو دیکھتے ہیں تو جی چاہا کہ چکرا کر گر پڑیں معلوم ہوتا تھا کہ ایک عظیم الشان خچند ر سامنے کھڑا ہے وہ اس وقت کوہِ آتش فشاں نظر آ رہا تھا۔ دل نے کہا اگر اس کے گیند سے واصل بحق ہو گئے تو جنت تک رن بنانے چلے جائیں گے ہمت کر کے بیٹ پر جھکے، ادھر وہ گیند لیکر بڑھا ہی تھا کہ ہم پھر کھڑے ہو گئے اور موت کچھ دیر کے لئے التوا میں پڑ گئی۔ مگر بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے۔ کھیلنے کے لئے تیار ہی ہونا پڑا اور بیٹ پر جھک کر آنکھیں بند کر لیں، دوسرے ہی لمحے محسوس یہ ہوا کہ جیسے ان ہاتھوں میں جن سے بیٹ تھامے ہوئے تھے ایک برقی لہر سی دوڑ گئی اور مجمع نے تحسین و آفرین کا شور بلند کیا۔ معلوم ہوا کہ گیند آیا اور بیٹ سے چھو کر کچھ ایسے زاویے سے نکل گیا کہ لوگوں کو غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ یہ کٹ ہماری استادی کا نتیجہ ہے، دو رن خواہ مخواہ بن گئے۔ کاش ایک ہی رن بنا ہوتا اور ہم اس خوفناک بولر کی زد سے

بچ گئے ہوتے۔ نتیجہ یہ کہ پھر کھیلنے کے لئے تیار ہونا پڑا اور جی کڑا کر کے اب کی مرتبہ کر لیا کہ ایسی بھی کیا نیم دلی مرنا ہی ہے تو نام کر کے مریں گے۔ اب کی مرتبہ ہٹ لگا بیٹھے۔ چنانچہ بجائے جما کر بیٹ رکھنے کے بیٹ تان کر کھڑے ہو گئے۔ مجمع نے شور مچایا، ساتھیوں نے پریشان ہونا شروع کر دیا۔ خود مخالف کھیلنے والوں کو حیرت ہوئی مگر ہم اپنے ارادے سے باز نہ آئے۔ چنانچہ اب جو گیند آتا ہے اور ہم ہٹ لگاتے ہیں تو سارا مجمع فیلڈ میں ٹوپیاں اچھالتا ہوا چلا آیا۔ قہقہوں سے فضا گونج اٹھی اور ہوش میں آنے کے بعد پتہ چلا کہ کیچ کرنے والے نے بجائے گیند کے بلّے کا کیچ کیا تھا اور گیند خود ہمارے لیگ گارڈ میں محفوظ تھا۔ مخالف ٹیم اس کو اپنی تذلیل سمجھ رہی تھی کہ یہ کھیل نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کا مذاق اڑوایا جا رہا ہے۔ بمشکل تمام ان لوگوں کو سمجھایا گیا کہ مشق چھوٹی ہوئی ہے ورنہ یہ علیگڈھ کی ٹیم کے وہ کپتان ہیں جو سات سو رن بنایا کرتے تھے۔ امپائر نے تعصب سے کام لیکر ہم کو آؤٹ قرار دیا اور ہم اسی حالت میں اسی وقت گھر پہنچا دیئے گئے۔ اس لئے اب تک کرکٹ کا نام سن کر غش آجاتا ہے۔

[م جھرل]